اگست ۱۹۶۳ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیرِ ادارت

امین احسن اصلاحی

قیمت فی پرچہ ، ساٹھ پیسے
سالانہ ، چھ روپے (پندرہ شلنگ)

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۹ | ربیع الاول ۱۳۸۳ھ ہجری | شمارہ ۲

فہرست مضامین

تذکرہ و تبصرہ	امین احسن اصلاحی	۲
تدبر قرآن		
تفسیر سورۂ بقرہ	"	۹
افادات فراہیؒ		
شریعت کی بنیاد اور اس کا مقصد	جناب خالد مسعود صاحب	۲۷
مراسلہ و مذاکرہ		
عقائد و عبادات کا تعلق تعمیر سیرت سے	امین احسن اصلاحی	۳۴
مقالات		
ہبہ علی الاولاد کے مسئلہ پر ایک نظر	جناب محمد اسلم صاحب چیمہ	۳۷
اقتباسات و تراجم		
آزادی اور غلامی	جناب محمود احمد صاحب	۴۸
تقریظ و تنقید (روح القرآن)		۵۴

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ
منیجر ماہنامہ "میثاق"
رحمان پورہ ـــــ اچھرہ لاہور ۱۲

ہندوستانی خریداروں کیلئے ترسیل زر کا
منیجر ہفت روزہ "ندائے ملت"
باغ گونگے نواب ـــــ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

اسلامی مشاورتی کونسل کا معاملہ شروع ہی سے کچھ عجیب و غریب سا رہا ہے۔ اوّل تو اس کے لئے جو اشخاص منتخب کئے گئے ان کے ناموں ہی کو سن کر اس کے مستقبل سے متعلق نہایت شدید قسم کی مایوسی ہو گئی تھی ثانیاً اس پر جو پابندیاں عاید کر دی گئی تھیں وہ ایسی غیر منطقی تھیں کہ ان کو دیکھتے ہوئے یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ اگر یہ کونسل کوئی کام کرنا بھی چاہے گی تو کس طرح کر سکے گی۔ چنانچہ اب یہ بات بالکل کھل کر سامنے آگئی کہ اپنے روز پیدائش سے لے کر آج تک کی وسیع مدت میں یہ کونسل مجالس قانون ساز کو کوئی ایک مشورہ بھی دینے کے قابل نہ ہو سکی۔ حالانکہ قومی خزانے کا ہزاروں لاکھوں روپیہ اس پر صرف ہو چکا ہو گا۔

حکومت کے ذمہ داروں کا کہنا یہ ہے کہ ہم نے ایک سے زیادہ معاملات میں کونسل کا فتویٰ معلوم کرنا چاہا لیکن اس کی طرف سے ہمیں کوئی جواب ہی نہیں موصول ہوا۔ کونسل کے ذمہ داروں کا جواب یہ ہے کہ ہمارے اُوپر بعض ایسی پابندیاں عائد ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے ہم کسی معاملہ میں جلدی جواب دے ہی نہیں سکتے۔ مثلاً یہ کہ وُہ اس بات کے پابند ہیں کہ جب ان کے سامنے حکومت کی طرف سے کوئی استفتا آئے تو وُہ اس سے متعلق ضروری معلومات و حقایق فراہم کرنے کی درخواست اس اسلامی ریسرچ کے ادارے سے کریں جو حکومت کے زیر اہتمام قائم ہے جب وُہ ضروری معلومات و حقایق فراہم کر کے دے تب

کونسل اس کی روشنی میں رائے قائم کرے اور اپنی اس رائے سے متعلقہ اداروں کو آگاہ کرے۔ کونسل کو شکوہ ہے کہ اب تک اس ادارے سے جن معاملات میں معلومات و حقایق فراہم کرنے کی خواہش کی گئی ادارے نے اس کی تعمیل ہی نہیں کی اس وجہ سے کونسل اس قابل نہیں ہو سکی کہ کسی استفتے کا جواب لکھ سکے۔

جب صورت حال یہ ہے تو ہمارے نزدیک حکومت بھی مجبور ہے اور کونسل بھی۔ حکومت کی مجبوری یہ ہے کہ اس غریب کو کیا خبر کہ کیا چیز اسلامی ہے اور کیا چیز غیر اسلامی، وہ تو کوئی رہنمائی حاصل کر سکتی ہے تو اسلامی کونسل ہی سے حاصل کر سکتی ہے، جب کونسل اس کو کوئی رہنمائی ہی نہ دے تو آخر وہ کیا کرے اور مجالس قانون ساز کے سامنے کیا چیز پیش کرے !!

رہی کونسل تو اس کی بے بسی بھی واضح ہے۔ جب اس کی محفل آرائی کے لئے وہ نومن تیل ضروری ہوا جو اسلامی ریسرچ کے کولہو سے نکلا ہوا ہو تو آخر وہ اس کی فراہمی کے بغیر ہی کس طرح تمام روایات و آداب کو توڑ کر بے نقاب و بے حجاب ہو جائے !

اس سلسلہ میں ہمیں اسلامی ریسرچ کے ادارے کا عذر اگرچہ معلوم نہیں ہو سکا ہے لیکن ہم یہ حسن ظن رکھتے ہیں کہ اس کی طرف سے بھی اگر کوئی تساہل ہو رہا ہو گا تو بے سبب نہیں ہو رہا ہو گا۔ عجب نہیں کہ اس کی ٹانگ بھی کسی اور ادارے کے ساتھ باندھ دی گئی ہو اور وہ اس الجھن میں پھنس کر کونسل کے جوابات لکھنے کی فرصت نہ پا رہا ہو۔

افسوس ہے کہ ہمارے ارباب اقتدار اگر اسلام کے نام پر کوئی کام عوام کو بہلانے کے لئے کرتے بھی ہیں تو اس کو بھی خوبصورتی کے ساتھ نباہنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ہر شخص روز اول سے جانتا ہے کہ اس اسلامی کونسل کے ہاتھوں نہ اسلام کا کچھ بننا تھا نہ کچھ بگڑنا بلکہ یہ محض اسلام اسلام پکارنے والے عوام کا جی خوش کر دینے کی ایک تدبیر تھی۔ حکومت کا فائدہ ہی تھا اگر اس کا کچھ بھرم قائم رکھنے ہی کی کوشش کی گئی ہوتی۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے کار فرما حضرات یہ بھی نہ کر سکے۔ اسی کونسل کا نام لے کر دستور کی اسلامیت کے گن گائے جاتے تھے اور اسی کے بل پر ہمارے صدر ریاست عوام کو اطمینان دلاتے تھے کہ دستور میں اسلام کی حفاظت کی پوری پوری ضمانت موجود ہے۔ اب وہی فرمائیں کہ جب حالات یہ ہیں جو ند کور ہوئے

تو ان کی اطمینان بخشی کی قدر و قیمت کیا رہ جاتی ہے۔

(۲)

عائلی قوانین جس بے تدبیری اور جلد بازی سے قوم پر مسلط کئے گئے تھے اس سے یہ اندیشہ شروع ہی میں پیدا ہوگیا تھا کہ اس کے نتائج نہایت پیچیدہ صورت میں برآمد ہوں گے۔ چنانچہ اب یہ عملی شکل میں سامنے آگئے ہیں جمہور کی طرف سے پوری شدت کے ساتھ اس کی منسوخی کا مطالبہ ہے لیکن حکومت نے اس کو اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیا ہے۔ صوبائی اور مرکزی مجالس قانون ساز کے ممبر حضرات اس کو آئندہ کے انتخاب کی روشنی میں دیکھ رہے ہیں، مغربی تہذیب کے دلدادگان اخواتین اور رجال دونوں ہی، اس کو اپنے لئے آزادی کا ایک چارٹر سمجھ رہے ہیں اور اسی پہلو سے اس کی حمایت میں لڑنے اور مرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، علماء کا طبقہ اس کو مداخلت فی الدین قرار دے چکا ہے اور اس کے نتیجہ میں اب قدرتی طور پر حکومت اور مغرب پسند طبقہ دونوں نے اس کو اپنا حریف قرار دے لیا ہے اور یہ کشمکش اب ایسی شکل اختیار کر چکی ہے کہ باہمی افہام و تفہیم کی توقع بہت کم ہے اور اگر فتح و شکست سے اس کا فیصلہ ہوا تو فتح خواہ کسی کی بھی ہو، اس سے کسی بہتر نتیجے کی توقع نہیں ہو سکتی۔

اس کا سب سے زیادہ خطرناک پہلو یہ ہے کہ اس طرح ہمارے ملک میں اسلام پسند اور مغرب پسند دونوں طبقے ایک دوسرے کے حریف بن کر اٹھ کھڑے ہوں گے اور ہر محاذ پر ان کے درمیان ایسی کشمکش برپا ہو جائے گی کہ کسی مشترک نقطہ نظر پر ان کا مجتمع ہونا ناممکن ہو جائیگا، اگرچہ ہمارے ملک میں یہ دونوں طبقات پہلے سے موجود ہیں اور ان کے درمیان نظریاتی اختلافات بھی ہیں لیکن ابھی اس اختلاف نے ہار جیت کا رنگ اختیار نہیں کیا تھا اس وجہ سے سمجھنے اور سمجھانے کے امکانات موجود تھے لیکن اب یہ اندیشہ ہے کہ ایک مرتبہ اگر یہ ہار جیت کی جنگ لڑ کر ایک دوسرے سے الگ الگ ہوگئے تو پھر ان کے ملنے کے تمام امکانات ناپید ہو جائیں گے، پھر ان کے اختلافات کا فیصلہ فتح و شکست کے میدان ہی میں ہوگا اور یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کشمکش میں آخری بازی کس کے ہاتھ رہے گی۔

ہمارے علماء کو معاملہ کے اس پہلو پر ہمیشہ نظر رکھنی چاہیئے اس لئے کہ اسی پر اس ملک

میں دین کے مستقبل کا انحصار ہے۔ ان کو اپنے وقار سے زیادہ دین کو پیش نظر رکھنا ہے۔ ان کی انتہائی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ بجائے اس کے کہ وہ ایک فریق بن کر لوگوں کے سامنے آئیں داعی اور مصلح کی حیثیت سے آئیں۔ یہی ان کا اصلی مقام ہے اور اسی مقام پر جمے رہ کر وہ مغربیت کی اس یلغار کا مقابلہ کر سکیں گے جس سے اب وہ عملاً دوچار ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ مصر، ترکی، ایران ہر جگہ یہ کشمکش برپا ہو کر ایک نتیجہ تک پہنچ چکی ہے۔ ہم اس اعتبار سے خوش قسمت ہیں کہ ہمارے ہاں یہ جنگ سب کے بعد چھڑی ہے۔ اس وجہ سے ہم حالات سے نتائج اخذ کرنے اور تجربات سے فائدہ اٹھانے کے معاملہ میں دوسروں سے زیادہ بہتر پوزیشن میں ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس موقع پر ہمارے علماء اور حامیان دین کو صحیح قدم اٹھانے کی توفیق دے اور ان رجحانات سے ان کو محفوظ رکھے جو گمراہی کا باعث ہوئے۔

(۳)

حلقہ تدبر قرآن کا کام مختلف الجھنوں کے باوجود خدا کے فضل و کرم سے بڑی پابندی اور گرمی کے ساتھ جاری ہے۔ جو رفقاء اس میں شریک ہوئے تھے ان کی اکثریت التزام کے ساتھ اسباق میں حاضر ہوتی ہے اور پورا پورا فائدہ اٹھا رہی ہے۔ ان میں کچھ طالب علم ایسے ہیں جن کی ترقی نے خود مجھے حیرت میں ڈال دیا ہے اور میں اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے اپنے اس عاجز بندے کو اپنے دین کی ایک حقیر خدمت کی توفیق بخشی اور ساتھ ہی اس محرومی پر حسرت ہے کہ یہ کام میں بہت پہلے کیوں نہ شروع کر سکا۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو آج بہت سے ذی صلاحیت و ذی علم نوجوان اسلام کی مدافعت میں لڑنے کے لئے میدان عمل میں موجود ہوتے۔

اپنی اس خواہش کا اظہار میثاق کی کسی پچھلی اشاعت میں کر چکا ہوں کہ میں اس حلقہ کو ایک باقاعدہ ادارے کی شکل دینا چاہتا ہوں۔ اس راہ میں سب سے بڑی مشکل جو اب تک تجربے میں آئی وہ یہ تھی کہ ایسے لوگ نہایت کمیاب بلکہ نایاب ہیں جو کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نکلے ہوئے لوگوں کو سہل اور مختصر طریقوں سے عربی زبان سکھا سکیں اور قرآن و حدیث کی تعلیم و تفہیم میں وہ راہ اختیار کر سکیں جو جدید تعلیم پائے ہوئے لوگوں کی ذہنی الجھنیں دور کر سکے۔ اس مشکل کے پیش نظر میں نے اپنی ساری توجہ اس امر پر مرکوز کر دی ہے کہ پہلے اس مقصد کے لئے موزون

اشخاص تیار کئے جائیں۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس کوشش میں جیسا کہ اُوپر اشارہ کر چکا ہوں، مجھے میری توقعات سے کہیں زیادہ کامیابی ہوئی۔ بعض رفقاء نے نحو و ادب میں اتنی ترقی کر لی ہے کہ اب وہ اپنے نئے یا کمزور ساتھیوں کی تعلیم و تربیت میں بڑے سلیقہ کے ساتھ میرا ہاتھ بٹا رہے ہیں اور ان کا کام میرے نزدیک پوری طرح قابلِ اطمینان ہے۔ اسی طرح اس حلقہ میں بعض ایسے رفقا بھی ہیں جو ان شاء اللہ بہت جلدی قرآن و حدیث کی تعلیم اور فکری و عملی تربیت کے کاموں میں بھی میرا ہاتھ بٹانے کے قابل ہو جائیں گے۔

اب میری دلی آرزو یہ ہے کہ یہ حلقہ ایک باقاعدہ ادارے کی شکل اختیار کر لے جو برابر کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نکلے ہوئے لوگوں کی دینی تعلیم و تربیت کی خدمت کو تسلسل کے ساتھ جاری رکھ سکے اور اس کی کوشش سے ہماری قوم کو دین کے ایسے خدمت گزار مل سکیں جو ایک طرف جدید تعلیم سے آراستہ ہوں اور دوسری طرف دین میں پوری بصیرت رکھنے والے ہوں۔ تفسیر تدبر قرآن کی تکمیل کے ساتھ ساتھ یہ سب سے عزیز آرزو ہے جو میرے ذہن و دماغ پر اس وقت حاوی ہے اور میں جس کے لئے اپنے رب سے شب و روز دعا کر رہا ہوں کہ وہ اپنے فضل خاص سے اس کے اسباب و وسائل فراہم فرما دے۔ اس مقصد کے لئے فی الحال دو چیزوں کی فوری ضرورت ہے۔

اوّل ایک موزون مکان کی جو اتنی وسعت رکھنے والا ہو کہ اس میں تربیت گاہ، کتبخانہ، اور باہر سے آنے والے طلبہ کے قیام کے لئے گنجائش نکل سکے۔

دوسری قرآن، حدیث، فقہ، ادب اور تاریخ سے متعلق ان مرکزی کتابوں کی جو تحقیق اور ریسرچ کے کاموں کے لئے ناگزیر ہیں۔

میرے پاس اگرچہ ذاتی کتابوں کا کچھ زیادہ ذخیرہ نہیں ہے تاہم میں یہ ارادہ رکھتا ہوں کہ اگر اس ادارے کے قیام کی کوئی شکل اللہ تعالیٰ پیدا کر دے تو میں اپنی کتابیں اپنے مسودات سمیت اس ادارے کی نذر کر دوں گا۔ بعض رفقاء اپنی ذاتی ضرورت کے لئے بھی کتابیں خرید رہے ہیں۔ حال میں ہمارے ایک رفیق عزیز نے ایک خطیر رقم خرچ کر کے عربی کا سب سے بڑا لغت لسان العرب خریدا ہے۔ عارضی طور پر ادارے کے رفقاء ان کی کتابوں سے بھی فائدہ

اُٹھا سکیں گے۔

میں اپنی صحت اور عمر کے لحاظ سے اب کچھ زیادہ فرصت کار کی امید نہیں رکھتا اس وجہ سے اپنی اس آرزو کو اپنی زندگی کی آخری آرزو سمجھتا ہوں۔ رب کریم کی رحمت سے بعید نہیں کہ اس کے ایک عاجز اور گنہگار بندے کی یہ آرزو پوری ہو جائے۔ میں اپنے ان تمام دوستوں، قدردانوں، ساتھیوں اور ہمدردوں کا شکر گزار اور ان کیلئے دل سے دعاگو رہوں گا جو اس آرزو کی تکمیل میں کسی پہلو اور کسی نوعیت سے بھی میری ہمت افزائی کریں گے۔

(۴)

اُوپر کی سطریں لکھی جا چکی تھیں کہ اس سلسلہ میں ایک ایسی چیز سامنے آئی جو ایک فال نیک کی حیثیت رکھتی ہے اس وجہ سے جی چاہتا ہے کہ اس مقصد کے قدردانوں اور ہمدردوں کو بھی اس کی اطلاع دے دی جائے۔ اس ادارے کے لئے کسی موزوں مکان کا خیال عرصہ سے ذہن میں تھا لیکن لاہور میں کسی مکان کا ملنا ہی ایک بڑا کٹھن مرحلہ ہے چہ جائیکہ کسی موزوں مکان کا ملنا۔ لیکن ادھر یک بیک بالکل تائید غیبی سے ایک ایسے مکان کے ملنے کی صورتیں پیدا ہو گئیں جو ہمارے پیش نظر مقاصد کے لئے نہایت مناسب ہے۔ مکان کی مشکلات کے پیش نظر رفقا کا مشورہ یہی ہوا کہ اس موقع سے فائدہ اُٹھایا جائے چنانچہ یہ مکان کرایہ پر حاصل کر لیا گیا ہے۔ اب تک اس ادارے کا سارا کام میری قیام گاہ پر ہوتا رہا تھا حلقہ پر کسی خرچ کا بار نہیں تھا یہ پہلا کام ہم نے ایک ایسا کیا ہے جس کے لئے ہمیں کچھ نہ کچھ خرچ کرنا پڑے گا۔ اس خرچ کے فراہم ہونے کی شکل یہی ہو سکتی ہے کہ کچھ تو حلقہ کے رفقا اپنے ذمہ لیں اور کچھ ہمارے مخلصین اور ہمدرد حضرات اس میں تعاون کریں۔ اس طرح گویا عملاً اس مکان میں ادارے کی بنیاد پڑ جائے گی۔ اگرچہ یہ بنیاد ابھی بالکل ایک ابتدائی شکل میں ہو گی لیکن کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے اور اس بنیاد پر ایک مستقل ادارے کی عمارت قائم ہو جائے۔

جہاں تک میری عقل و فہم کا تعلق ہے اس کی رہنمائی میں یہ بات میں پورے اعتماد و وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس وقت اس ملک میں اسلام کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ ایسے

اشخاص تیار کئے جائیں جو موجودہ زمانہ کے تقاضوں کو سمجھنے والے اور دین میں بصیرت رکھنے والے ہوں۔ ایسے اشخاص ہی کے پیدا ہونے پر ان تمام کاموں کا انحصار ہے جو مسلمانوں کی صلاح و فلاح کیلئے کئے جا سکتے ہیں۔ اس وقت تو قحط الرجال کا یہ عالم ہے کہ ہمیں بھی ذاتی تجربہ سے معلوم ہوا اور دوسرے مخلصین بھی جگہ جگہ سے شکایت لکھ رہے ہیں کہ وہ اپنے اپنے شہروں میں حلقہ تدبر قرآن کے نمونہ پر حلقے قائم کرنا چاہتے ہیں لیکن ایسے آدمی نہیں دستیاب ہو رہے ہیں جو کامیابی کے ساتھ نئی نسل کو دین کی تعلیم دے سکیں۔ بعض دینی درسگاہوں میں بھی یہ کام شروع ہوا لیکن ان کے طریقہ تعلیم کی فرسودگی کے سبب سے کامیاب نہ ہو سکا۔ لیکن ہمارا تجربہ یہ ہے کہ نئی نسل کو بڑی آسانی سے دین کی تعلیم دی جا سکتی ہے بشرطیکہ اس کے لئے وہ طریقہ اختیار کیا جائے جو ہم نے اختیار کیا ہے۔ ہمارے پیش نظر پہلی مہم اشخاص کی تیاری کی ہے۔ کچھ اشخاص کے تیار ہو جانے کے بعد ہی مزید اشخاص کے تیار کرنے اور پھر عام اصلاح و تربیت کے لئے آگے کے قدم اٹھائے جا سکتے ہیں۔ کیا عجب کہ یہیں سے کسی صحیح قسم کی تنظیم کے لئے بھی راہ کھل سکے جس کے لئے بہت سے مخلصین اپنے اندر بیچینی محسوس کر رہے ہیں۔ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سب سے پہلے دین میں بصیرت رکھنے والے اشخاص تیار کئے اور پھر ان کو عام اصلاح و دعوت کا ذریعہ بنایا۔ میں نے اپنی استعداد و صلاحیت کے مطابق دین کی یہ خدمت شروع کر دی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کام میں مدد فرمائے گا اور دین سے محبت رکھنے والوں کا مجھے تعاون حاصل ہوگا۔

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۂ البقرہ

(۳۱)

۶۰۔ آگے کا سلسلہ کلام آیات (۱۷۸-۱۷۹)

برّ و تقویٰ کی اصلی حقیقت واضح کرنے کے بعد اُن معاملات کی طرف توجہ فرمائی جو اسی برّ و تقویٰ پر مبنی ہیں اور جن کی اس اعتبار سے بڑی اہمیت ہے کہ انہی پر معاشرہ کے امن و عدل اور اس کے تحفظ و بقاء کا انحصار ہے۔ اگر ایک متوسط درجہ کا ذہن رکھنے والا آدمی بھی غور کرے گا تو وہ نہایت آسانی سے اس حقیقت تک پہنچ سکتا ہے کہ انسانوں اور انسانوں کے تعلقات کی استواری کی بنیاد اصلاً دو چیزوں پر ہے۔ ایک اس چیز پر کہ ہر شخص دوسرے کی جان کا احترام کرے دوسرے اس چیز پر کہ ہر شخص دوسرے کے مال کا احترام کرے۔ اسی وجہ سے حرمت جان اور حرمت مال کے قانون کو ہمیشہ سے دوسرے تمام قوانین پر فوقیت حاصل رہی ہے۔ اسی اصل کے تحت، جو تمام تر فطرت انسانی پر مبنی ہے، قرآن نے بھی برّ و تقویٰ کی بنیاد استوار کرنے کے بعد سب سے پہلے احترام جان کے قانون کو لیا اور قصاص کو پورے معاشرے کی ذمہ داری قرار دیا۔ یعنی اگر کوئی شخص قتل ہو گیا ہے تو یہ صرف اس کے عزیزوں اور رشتہ داروں ہی کی ذمہ داری نہیں ہے کہ اس کے قاتل کا کھوج لگائیں اور اس کو سزا دیں بلکہ پورے معاشرہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کا تعاقب کرے اور اس کو کیفر کردار کو پہنچائے۔ گویا ایک شخص کا قتل ہونا سب کا قتل ہونا، اور اس کا زندہ ہونا سب کا زندہ ہونا ہے۔

قصاص کا یہ قانون موجود تو اہل کتاب کے ہاں بھی تھا اور اہل عرب کے ہاں بھی مگر انہوں نے جس طرح ہر قانون کی رُوح کچل کے رکھ دی تھی اسی طرح اس قانون کی رُوح بھی ختم کر دی تھی۔ اس قانون کی اصل روح بے لاگ انصاف اور کامل مساوات ہے۔ یعنی اس معاملہ میں ادنیٰ و اعلیٰ، امیر و غریب، شریف و وضیع اور آقا و غلام سب ایک ہی سطح پر رکھے جائیں اور قانون اور عدالت دونوں کے ساتھ بالکل یکساں معاملہ کریں۔ لیکن یہ بات نہ اہل کتاب کے یہاں باقی رہ گئی تھی نہ اہل عرب کے یہاں بلکہ یہ کہنا بھی شاید بیجا نہیں ہوگا کہ آج بھی تہذیب و تمدن کی اس ترقی کے باوجود دنیا کے کسی ملک اور کسی قانون میں بھی احترام جان اور مساوات کا یہ تصور نہیں پایا جاتا جو قرآن نے پیش کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

"اے ایمان والو تم پر مقتولوں کا قصاص لینا فرض ٹھہرایا گیا ہے۔ آزاد آزاد کے بدلے، غلام غلام کے بدلے، عورت عورت کے بدلے۔ پس جس کسی کے لئے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ رعایت کی گئی تو اس کے لئے دستور کی پیروی کرنا اور خوبی کے ساتھ اس کو ادا کرنا ہے۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے ایک قسم کی تخفیف اور مہربانی ہے۔ تو اس کے بعد جو زیادتی کرے گا اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔ اور تمہارے لئے قصاص میں، اے عقل والو، زندگی ہے۔ تاکہ تم حدود الٰہی کی پابندی کرو۔"

۶۱۔ الفاظ کی شرح اور جملوں کی وضاحت

قصاص، قصص سے ہے جس کے اصل معنی کسی کے پیچھے، اس کے نقش قدم کے ساتھ ساتھ چلنے کے ہیں۔ مثلاً۔ وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۱۱۔ قصص (اور اس نے اس کی بہن سے کہا، اس کے پیچھے پیچھے جا، تو وہ دور

سے اس کو دیکھتی رہی اور ان لوگوں کو اس کا علم نہیں ہوا) قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ۶۴ کہف (اس نے کہا یہی تو ہمیں مطلوب تھا، پس وہ دونوں اپنے نقش قدم کا تعاقب کرتے ہوئے پیچھے پلٹے) اسی سے قصہ کو قصہ کہتے ہیں، کیونکہ جس کا قصہ بیان کیا جاتا ہے، قصہ بیان کرنے والا گویا اس کے قدم بہ قدم اس کے حالات کا تعاقب کرتا ہے۔ اسی سے قصاص نکلا اس لئے کہ قاتل کا بھی کھوج لگایا جاتا اور اس کا تعاقب کیا جاتا ہے۔ پھر قصاص اس سزا کو کہنے لگے جس میں مجرم کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جائے جس کا مرتکب وہ خود ہوا ہے۔ اس قصاص کی دو صورتیں ہیں۔ ایک جانی، دوسری مالی جس کو دیت یا خونبہا کہتے ہیں۔ قصاص کا لفظ اپنے وسیع معنی میں ان دونوں ہی صورتوں پر حاوی ہو جاتا ہے اس لئے کہ دیت بھی درحقیقت قصاص ہی کی ایک شکل ہے۔ اصل قانون تو جان کے بدلے جان ہی کا ہے۔ لیکن اولیائے مقتول کی بہبود کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس قانون میں اتنی رعایت فرما دی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو جان کے بدلے دیت بھی لے سکتے ہیں۔

"كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى" میں کُتِبَ کے بعد علیٰ کا استعمال اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں اس کے اندر فرضیت اور وجوب کا مضمون موجود ہے۔ قتلیٰ قتیل کی جمع ہے جس کے معنی مقتول کے ہیں۔ یہ لفظ مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے یکساں استعمال ہوتا ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوگا کہ اگر كُتِبَ عَلَيْكُمُ سے قصاص کی فرضیت ثابت ہوتی ہے تو اس حکم کا مخاطب کون ہے؟ یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ اسلام میں یہ بات اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ قصاص کا معاملہ قابل راضی نامہ ہے۔ اگر مقتول کے ورثہ چاہیں تو قاتل کو قتل بھی کر سکتے ہیں، چاہیں تو دیت بھی لے سکتے ہیں، چاہیں تو کچھ معاف بھی کر سکتے ہیں۔ تو جب وہ یہ سب کچھ کر سکتے ہیں تو یہ کہنے کے کیا معنی کہ "تم پر قصاص لینا فرض کیا گیا ہے"۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس حکم کا مخاطب پورا اسلامی معاشرہ بحیثیت مجموعی یا بالفاظ دیگر اسلامی حکومت ہے۔ اس کے اوپر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ اس کے علاقہ میں اگر کوئی قتل ہو جائے تو اس کے قاتلوں کا سراغ لگائے، ان کو گرفتار کرے اور قانون کے مطابق ان پر سزا نافذ کرے۔ یہ ذمہ داری معاشرہ یا حکومت پر اس اصول کے تحت ڈالی گئی ہے کہ جو شخص کسی شخص کو بغیر کسی حق قانونی کے قتل کر دیتا ہے تو وہ صرف ایک شخص ہی کا قاتل نہیں ہے بلکہ

سب کا قاتل ہے اس لئے کہ اس نے تحفظ جان کے اس قانون کو ہدم کر دیا ہے جو سب کے لئے حرمت جان کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ اس وجہ سے یہ پورے معاشرہ اور پورے نظام اجتماعی کی ذمہ داری ٹھہری کہ سب اس کے قصاص کے درپے ہوں اور اس وقت تک دم نہ لیں۔ جب تک حرمت جان کے اس قانون کو زندہ کر کے سب کی زندگی کی ضمانت کو بحال نہ کر لیں اسی حقیقت کی طرف سورہ مائدہ میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے۔ اِنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۳۲ (کہ جس نے کسی جان کو، بغیر اسکے کہ اس نے کسی کی جان ماری ہو، یا زمین میں فساد مچایا ہو قتل کر دیا تو گویا اس نے سارے ہی لوگوں کو قتل کر دیا اور جس نے اس کو زندہ کیا تو گویا سب کو زندہ کیا)

غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ قصاص کی اصل ذمہ داری حکومت ہی پر ہونی چاہئے نہ کہ مقتول کے وارثوں پر اس لئے کہ اس کا بھی امکان ہے کہ ایک شخص قتل ہو جائے اور اس کا کوئی ولی وارث نہ ہو، اس کا بھی امکان ہے کہ ایک شخص کے کچھ ورثا ہوں تو سہی لیکن کسی سبب سے ان کو مقتول کے قصاص کے معاملہ سے کچھ دلچسپی نہ ہو۔ بلکہ امکان تو خاصی حد تک اس بات کا بھی ہے کہ ورثہ کی اصل ہمدردی اور دلچسپی کسی سبب سے مقتول کے بجائے قاتل اور اس کے شرکائے کار ہی کے ساتھ ہو جائے۔ علاوہ ازیں کسی اس طرح کے معاملہ میں تحقیق و تفتیش کی ذمہ داریاں اور پھر حدود کی تنفیذ بڑے وسیع اختیارات کی مقتضی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے جہاں تک قصاص لینے کے فرض کا تعلق ہے وہ تو اسلامی حکومت ہی پر عائد کیا ہے لیکن اس سلسلہ میں اس نے حکومت پر یہ پابندی بھی عائد کر دی ہے کہ وہ بجائے خود فیصلہ کرنے کے مقتول کے اولیاء کو یہ اختیار دیدے کہ وہ اسلامی قانون کے حدود کے اندر مجرم کے ساتھ جو معاملہ پسند کریں وہ کر لیں خواہ اسے قتل کر دیں، خواہ اس سے خونبہا قبول کر لیں۔ ورثہ کو یہ اختیار دے دینا اور ان کے اختیار کو نافذ کر دینا حکومت کو اس فرض سے سبکدوش کر دے گا جو اس پر كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى کی رو سے عائد ہوتا ہے۔

قصاص کے معاملہ میں مقتول کے اولیاء کی مرضی کو اسلام نے یہ اہمیت جو دی ہے یہ مختلف پہلوؤں سے نہایت حکیمانہ ہے۔ قاتل کی جان پر مقتول کے وارثوں کو براہ راست اختیار مل جانے

سے ایک توان کے بہت بڑے زخم کے اندمال کی ایک شکل پیدا ہوتی ہے، دوسرے اگر اس صورت میں یہ کوئی نرم رویہ اختیار کریں تو قاتل اور اس کے خاندان پر یہ اُن کا براہ راست احسان ہوتا ہے جس سے نہایت مفید نتائج کی توقع ہو سکتی ہے، تیسرے دیت کی شکل میں مقتول کے ورثہ کی، بالخصوص جب کہ وہ غریب ہوں، ایسی مدد ہو جاتی ہے جس سے ان کو بڑا سہارا مل سکتا ہے۔ اگر ورثا کو اس میں کوئی دخل نہ رہ جائے، سارا اختیار پولیس اور عدالت ہی کو سونپ دیا جائے، جیسا کہ موجودہ قوانین میں ہے تو وُہ ان تمام فوائد سے یکسر محروم ہو جاتے ہیں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا۔ لیکن ان کے اس حق کے تسلیم کئے جانے کے باوجود قصاص کی اصل ذمہ دار اور اس کی تنفیذ کرنے والی ہے حکومت ہی اس وجہ سے اگر وہ کسی خاص معاملہ میں محسوس کرے کہ وارثوں کی سرد مہری یا ان کی قاتلوں کے ساتھ ہمدردی کی وجہ سے قصاص کا حق ادا نہیں ہو رہا ہے جس سے حرمت جان کا قانون متاثر ہو رہا ہے تو وُہ اس نقصان سے قانون کو بچانے کے لئے مناسب اقدام کرے گی۔

"آزاد، آزاد کے بدلے، غلام، غلام کے بدلے، عورت، عورت کے بدلے"۔ یہ اس کامل مساوات کا بیان ہے جو قصاص میں لازماً ملحوظ رکھتی ہے۔ یعنی اگر ایک آزاد نے دوسرے آزاد کو قتل کیا ہے تو النفس بالنفس کے قانون کے بموجب وہ آزاد ہی اس آزاد کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا اور بصورت خونبہا ایک آزاد ہی کی دیت اس کے بدلہ میں واجب ہو گی۔ عرب جاہلیت کے طریقہ کے مطابق یہ نہیں ہو گا کہ مقتول کے ورثا اپنی شرافت و برتری کے زعم میں یہ مطالبہ کریں کہ وہ اپنے ایک مقتول کے بدلہ میں قاتل کے خاندان کے دو یا اس سے زیادہ آزادوں کو قتل کریں گے، یا عورت کے بدلہ میں مرد کو قتل کریں گے یا غلام کے بدلہ میں آزاد کو قتل کریں گے یا بصورت دیت عورت کی دیت مرد کی دیت کے برابر وصول کریں گے یا غلام کی دیت آزاد کی دیت کے معیار سے لیں گے۔ اسی طرح قاتل اور اس کے خاندان و قبیلہ والوں کو بھی اپنی شرافت و نجابت اور برتری کے زعم میں یہ دعویٰ کرنے کا حق نہیں ہے کہ ہمارا غلام دوسروں کے آزاد کا کفو یا ہماری ایک عورت دوسروں کے مرد کے برابر ہے اس وجہ سے ہم قصاص جانی یا مالی میں اسی نسبت کا لحاظ کرتے ہوئے مقتول کے ورثہ سے معاملہ کریں گے۔ اسلام

نے اس کامل مساوات کا اعلان کر کے زمانہ جاہلیت کی مذکورہ تمام نابرابریوں کا خاتمہ کر دیا۔ یہود نے بھی اس معاملہ میں شریف و رذیل اور اسرائیل اور غیر اسرائیل کے درمیان امتیاز قائم کر رکھا تھا۔ اس اعلان سے اس امتیاز کی بنیاد بھی ڈھ گئی۔ ایک طرف اسلام کے اس قانون کو ملاحظہ فرمائیے، جو چودہ سو سال سے اسلام کی کتاب تعزیرات میں موجود ہے، دوسری طرف عدل و مساوات کے علمبردار امریکہ میں کالوں اور گوروں کے اس امتیاز پر نظر ڈالئے جو زندگی کے ہر شعبہ میں آج اس بیسویں صدی میں بھی برتا جا رہا ہے۔

فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ۔ یعنی اگر مقتول کے ورثا کی طرف سے قاتل کو کچھ چھوٹ دے دی گئی۔ اس چھوٹ کی شکل یہی ہو سکتی ہے کہ وہ قصاص جانی کے بجائے قصاص مالی پر راضی ہو جائیں تو قاتل اور اس کے خاندان والوں کا فرض ہے کہ وہ احسان مندی اور شکر گزاری کے جذبہ کے ساتھ معروف کے بموجب دیت ادا کر دیں اور ادائیگی نہایت حسن و خوبی کے ساتھ کریں۔ معروف سے مراد یہاں اہل عرب کا رواج اور دستور ہے جس کو دیت کے معاملہ میں اسلام نے قانون کی حیثیت دے دی۔ حسن و خوبی کے ساتھ ادائیگی کی تاکید اس لئے فرمائی کہ عرب میں دیت کی ادائیگی بالعموم نقد کی صورت میں نہیں بلکہ جنس و مال کی شکل میں ہوتی تھی۔ اس وجہ سے اگر ادائیگی کرنے والوں کی نیت اچھی نہ ہو تو وہ اس میں بہت کچھ چالیں چل سکتے تھے۔ یہ بات بڑی آسانی سے ممکن ہے کہ اونٹوں یا بکریوں کی تعداد یا غلہ اور کھجور کی مقدار و کمیت کے لحاظ سے تو دیت کا مطالبہ پورا کر دیا جائے لیکن باعتبار حقیقت و کیفیت اس کی حیثیت محض خانہ پُری ہی کی ہو۔ اگر ایسا ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان لوگوں کے احسان کی کوئی قدر نہیں کی گئی جنہوں نے ایک شخص کی جان پر شرعی اختیار پا کر اس کو معاف کر دیا اور اس کی طرف سے مال قبول کر لینے پر راضی ہو گئے۔ ان کے احسان کا جواب تو احسان ہی ہونا چاہیئے۔ یعنی دیت کی ادائیگی اس خوبی، فیاضی اور اس کشادہ دلی کے ساتھ کی جائے کہ ان کو یہ صدمہ نہ اٹھانا پڑے کہ انہوں نے اپنے ایک عزیز کے خون کے بدلے میں بھیڑ بکریاں قبول کر کے کوئی غلطی یا بے غیرتی کی۔

قصاص کے حکم کے تحت یہاں بغیر کسی سابق قرینہ کے جو خونبہا کا ذکر آ گیا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے یعنی قصاص کا لفظ اپنے عام مفہوم میں قصاص جانی اور

قصاص مالی دونوں ہی پر مشتمل ہے۔ اس میں کچھ چھوٹ ملنے کے معنی جیسا کہ فَمَنْ عُفِیَ لَہٗ مِنْ اَخِیْہِ شَیْءٌ کے الفاظ سے واضح ہے یہ ہے اولیائے مقتول جان کے بدلے جان لینے کے بجائے رواج کے مطابق خونبہا لینے پر راضی ہو جائیں۔ یہ خونبہا کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک رعایت و رحمت ہے حرمت جان کا اصل حق تو یہی تھا کہ جان کے بدلے جان لی جاتی لیکن یہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنی مہربانی سے اس میں رعایت فرمادی ہے تو اس رعایت کی قدر کرنی چاہیئے اور اس سے کوئی غلط فائدہ نہیں اُٹھانا چاہیئے۔

فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِکَ فَلَہٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۔ یعنی جو لوگ اس رعایت سے فائدہ اُٹھانے کے بعد کسی ظلم و زیادتی کی راہ کھولیں گے تو وہ یاد رکھیں کہ پھر ان کے لئے آخرت کا عذاب دردناک ہی ہے جس سے چھڑانے والی کوئی چیز بھی نہیں ہوگی۔ اس میں قاتل اور اس کے خاندان والوں کے لئے بھی تنبیہہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کے بعد یہ انتہائی کفران نعمت ہوگا کہ اس کے پردے میں مقتول کے خاندان پر کسی نئے ظلم کے لئے اسکیم بنائی جائے۔ مثلاً یہ کہ قاتل اور اس کے اعزا یہ منصوبہ بنائیں کہ اس وقت تو کسی طرح مقتول کے ورثا کو دیت پر راضی کر کے اپنی جان بچا لو پھر موقع پیدا کر کے ان کو مزید نقصان پہنچائیں گے۔ اسی طرح اس میں مقتول کے وارثوں کے لئے بھی تنبیہہ ہے کہ انہیں اپنے دل میں یہ منصوبہ رکھ کے دیت کا راضی نامہ نہیں کرنا چاہیئے کہ اس وقت تو قاتل سے دیت لے لیتے ہیں، بعد میں موقع ملنے پر اس کی جان بھی ٹھکانے لگا دیں گے۔ خدا کی بخشی ہوئی ایک رعایت کے تحت جو راضی نامہ ہو گیا ہے، دونوں فریق کو سچے دل سے اس کا احترام کرنا چاہیئے۔ جو بھی یہ راضی نامہ ہو چکنے کے بعد کوئی زیادتی کرے گا وہ اللہ کے غضب کا مستحق ٹھہرے گا۔

وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ ..... لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ | یہ معاشرہ کو تلقین ہے کہ قصاص کے معاملہ میں کسی سہل انگاری، کسی جانبداری، کسی چشم پوشی اور کسی بیجا رحم و مروت کو حائل نہیں ہونے دینا چاہیئے۔ جو شخص کسی کو قتل کرتا ہے وہ صرف ایک شخص ہی کو قتل نہیں کرتا بلکہ اس قانون کو قتل کرتا ہے جو سب کی جان کی حفاظت کا ضامن ہے اس وجہ سے وہ گویا سب ہی کو قتل کر دیتا ہے اس وجہ سے یہ سب کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کا قصاص لے کر اس ضمانت کو بحال کریں جس میں

سب کی زندگی ہے۔ معاشرہ کا جو شخص کسی قاتل کو پکڑتا ہے، یا اس کا سُراغ لگاتا ہے یا اس کے جرم کے ثبوت فراہم کرتا ہے اور اس طرح مقتول سے قصاص کی راہ کھولتا ہے وہ گویا اس مقتول کو بھی زندہ کرتا ہے اور ساتھ ہی پُورے معاشرہ کو بھی زندگی بخشتا ہے کیونکہ وہ اپنی اس خدمت سے اس قانون کو زندہ کرتا ہے جو سب کے لئے زندگی ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کی طرف سورہ مائدہ میں یوں اشارہ فرمایا ہے جس کا حوالہ اوپر بھی گذر چکا ہے۔

اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا۔ (۳۲۔ مائدہ)

یہ کہ جس نے قتل کر دیا کسی جان کو بغیر اس کے کہ اس نے کسی جان کو قتل کیا ہو یا زمین میں کوئی فساد برپا کیا ہو تو گویا اس نے سب کو قتل کر دیا اور جس نے اس کو زندہ کیا تو گویا اس نے سب ہی کو زندہ کیا۔

اس میں اُن لوگوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہے جو بیجا قسم کی مروت و پاسداری یا ناروا قسم کے احترام شرافت و امارت کے جذبہ کے تحت بساط وقات مقتول کے بجائے قاتل ہی کی ہمدردی کو ثواب قرار دے بیٹھتے ہیں حالانکہ اصلی ہمدردی ہر ایک کے ساتھ، غریب ہو یا امیر، شریف ہو یا رذیل، قریب ہو یا بعید، جیسا کہ سورہ نساء کی آیت ۱۳۵ میں ہے، یہی ہے کہ اس کو خدا اور اس کے قانون کے حوالہ کیا جائے نہ کہ خُدا کے قانون سے چھڑا کر شیطان کے حوالہ لیکن اس حقیقت کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اہل عقل ہیں۔ اس وجہ سے آیت میں اہلِ عقل کو خاص طور پر خطاب فرمایا ہے۔

اہل عقل کو خاص طور پر توجہ دلانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جس طرح جذبات بعض اوقات قانون قصاص کے نفاذ میں مزاحم ہوتے ہیں اسی طرح جذبات سے مرعوب و مغلوب عقل بھی اس قانون کی اصلی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے سے قاصر رہ جاتی ہے۔ خاص طور پر اس زمانہ میں تو تمام جسمانی سزاؤں کے خلاف ایک مستقل فلسفہ بن گیا ہے جس کو پیش تو کیا جاتا ہے عقلیت اور فلسفہ کے روپ میں لیکن تجزیہ کیا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر بھی اصلی رُوح عقل کی نہیں بلکہ جذبات ہی کی ہے۔

ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ مجرموں سے جو جُرم سرزد ہوتے ہیں وہ اصلاً جذباتی بے اعتدالی،

عقلی عدم توازن اور ذہنی انتشار اور الجھاؤ کے نتیجہ میں صادر ہوتے ہیں اور یہ حالتیں آدمی کی بیماری کی حالتیں ہیں جن میں وہ مستحق اصلاح و تربیت اور علاج و دوا کا ہوتا ہے نہ کہ سزا کا۔ اس وجہ سے اس گروہ کے نزدیک کسی قاتل کو قتل کی سزا دینا ایسا ہی ہے جیسے کسی مریض کو بیمار ہونے پر اس کے علاج کے بجائے کوئی سزا دے دینا۔ اس گروہ کے نزدیک اس طرح کے مجرموں یا خود ان کے الفاظ میں اس طرح کے مریضوں کا علاج تعلیم و تربیت اور اصلاح نفسی و ذہنی کے ذریعہ سے ہونا چاہیئے نہ کہ سولی اور پھانسی سے۔

یہ نظریہ موجود تو دنیا میں ایک خاص گروہ میں شروع سے رہا ہے لیکن اس کو عملی اعتبار سے کبھی اہمیت حاصل نہیں ہو سکی اور نہ شاید کبھی حاصل ہو سکے۔ تاہم اس دورِ آخر میں چونکہ ٹالسٹائی اور مہاتما گاندھی جیسے لوگوں نے اس کی وکالت کی ہے اس وجہ سے بہت سے تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہن اس سے متاثر ہیں۔ ایسے لوگوں کی اُلجھن دُور کرنے کے لئے قانون قصاص کی اُس حکمت کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے جسکی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے خاص طور پر اہل عقل کو مخاطب کر کے یہ فرمایا ہے کہ اس کے اندر زندگی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ زندگی فرد کے لحاظ سے نہیں بلکہ معاشرے کے لحاظ سے ہے۔ اگر ایک شخص قتل کے جرم میں قتل کر دیا جاتا ہے تو بظاہر تو ایک جان کے بعد یہ دوسری جان بھی گویا تلف ہی ہوتی ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے دیکھئے تو اس کے قتل سے پورے معاشرے کے لئے زندگی کی ضمانت پیدا ہوتی ہے۔ اگر اس سے قصاص نہ لیا جائے، تو جیسی ذہنی خرابی میں مبتلا ہو کر ایک بے گناہ کے قتل کا مرتکب ہوا ہے وہ خرابی .....

.....

..... پورے معاشرے میں متعدی ہو جائے اور پھر اس کی ہلاکت انگیزیوں سے معاشرے کو بچانا ناممکن ہو جائے۔ بیماری اور بیماری میں فرق ہوتا ہے جو بیماریاں قتل، ڈکیتی، چوری اور زنا وغیرہ جیسے خطرناک جرائم کا سبب بنتی ہیں ان کی مثال ان بیماریوں کی ہے جن میں پورے جسم کو بچانے کے لئے بسا اوقات جسم کے کسی عضو کو کاٹ کر الگ کر دینا پڑتا ہے۔ اگرچہ کسی عضو کو کاٹ پھینکنا ایک سنگدلی کا کام معلوم ہوتا ہے لیکن ایک ڈاکٹر کو یہ سنگدلی اختیار کرنی پڑتی ہے

اگر وہ طبیعت پر جبر کر کے یہ سنگدلی اختیار نہ کرے تو اس ایک عضو کی ہمدردی میں اسے مریض کے پورے جسم کو ہلاکت کے حوالہ کرنا پڑے گا۔

معاشرہ اپنی مجموعی حیثیت میں ایک جسم سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس جسم کے بعض اعضا میں بھی بسا اوقات اسی قسم کا فساد و اختلال پیدا ہو جاتا ہے جس کا علاج مرہم و ضماد سے ممکن نہیں ہوتا بلکہ عضو مریض پر اپریشن کر کے اس کو جسم کے مجموعہ سے الگ کر دینا ضروری ہوتا ہے۔ اگر یہ خیال کیا جائے کہ یہ عضو مریض ہے اس وجہ سے نرمی اور ہمدردی کا مستحق ہے تو اس نرمی کا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ ایک دن یہ ایک عضو سارے جسم کو سڑا اور گلا کر رکھ دے۔

یہی نکتہ ہے کہ قرآن مجید نے اس قسم کی سزاؤں کو جو سخت نوعیت کی ہیں، نکال کے لفظ تعبیر کیا ہے۔ نکال عربی میں اس سزا کو کہتے ہیں جو دوسروں کو عبرت دلانے والی ہو جس کو دیکھ کر دوسرے نصیحت پکڑیں اور اس قسم کے جرم کے ارتکاب سے باز رہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس طرح کی سزائیں نافذ کر کے گویا پورے معاشرہ کو ایسے ٹیکے لگا دیئے جاتے ہیں جس سے وہ متعدی جراثیم کے اثرات سے محفوظ ہو جائے۔ اسی حقیقت کی طرف یہاں بھی قرآن نے لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ، کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے جس کے معنی ہیں تاکہ تم بچو یعنی اللہ کے حدود کی خلاف ورزی اور ایک دوسرے پر ظلم و تعدی سے بچو۔

۶۲۔ آگے کا سلسلہ کلام آیات (۱۸۰-۱۸۲)

حرمت جان کے اس قانون کے بعد حرمت مال کے قانون کی طرف توجہ فرمائی۔ یہ دونوں مضمون قرآن و حدیث[1] دونوں میں بالعموم ساتھ ساتھ آتے ہیں اور عقل و فطرت میں بھی ان دونوں کے درمیان بڑا قریبی رشتہ ہے۔ حرمت مال کے سلسلہ میں بنیادی چیز یہ ہے کہ ایک قانون کے تحت ہر شخص کے اور اس کے بعد اس کے وارثوں کے حقوق متعین و محفوظ ہوں اور دوسرے ان حقوق کا احترام کریں۔ اہل عرب میں اگرچہ معروف کے تحت والدین اور اعزا و اقربا کے حقوق کافی الجملہ تعین تھا لیکن ان کی زندگی کے ہر پہلو میں جس طرح خرابیاں پیدا ہو گئیں اسی طرح اس پہلو میں بھی

---

[1] ملاحظہ ہو آیت ۲۹۔ نساء۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ حرمۃ مالہ کحرمۃ دمہ (اس کے مال کی عزت اس کی جان کی عزت کی طرح ہے)

فساد رونما ہوا اور ان کے زور آور لوگوں میں کمزور ورثوں اور حقداروں کے حقوق ہڑپ کرنے کا رجحان اس شدت کے ساتھ زور پکڑ گیا کہ معروف کی ان کے ہاں کوئی قدر و قیمت ہی باقی نہیں رہ گئی۔ سورہ فجر میں اسی صورت حال کی طرف اشارہ فرمایا ہے وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا (اور تم وراثت کو سمیٹ کر کھاتے ہو) یہ صورت تقاضا کر رہی تھی کہ قانون کے ذریعہ سے اعزا و اقربا کے حقوق کا تعین کر کے ان کی حفاظت کا سامان کیا جائے لیکن اس سورہ کے زمانہ نزول تک معاشرہ ابھی اتنا مستحکم نہیں ہوا تھا کہ تقسیم وراثت کا وہ مستقل قانون نافذ ہو سکے جو سورۂ نساء میں ہے اس وجہ سے عبوری دور کے لئے مورثوں کو دستور کے مطابق والدین اور قرابت مندوں کے لئے وصیت کی ہدایت ہوئی اور وارثوں کو اس وصیت کی تعمیل کی۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے وارثوں کے حقوق کے تعین سے متعلق خود اپنی وہ وصیت نازل فرما دی جو سورۂ نساء میں مذکور ہے تو بندوں کی وصیت منسوخ ہو گئی صرف اللہ تعالیٰ کی وصیت باقی رہ گئی۔ پھر بندوں کے لئے وصیت کا حق صرف ایک محدود دائرہ کے اندر رہ گیا جس کا ذکر سورہ نساء کی مذکورہ آیت کے تحت آئے گا۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ِۨ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝ فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ع

"جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آن پہنچے اور وہ کچھ مال چھوڑ رہا ہو تو تم پر فرض کیا گیا ہے والدین اور قرابت مندوں کے لئے دستور کے مطابق وصیت کرنا، خدا سے ڈرنے والوں پر یہ حق ہے۔ تو جو لوگ اس وصیت کو اس کے سننے کے بعد بدل ڈالیں تو اس کا گناہ ان بدل ڈالنے والوں ہی پر ہے، بے شک اللہ سننے والا اور علم رکھنے والا ہے۔ جس کو کسی وصیت کرنے والے کی طرف سے کسی بے جا جانبداری یا حق تلفی کا اندیشہ ہو اور وہ آپس میں صلح کرا دے تو اس میں کوئی گناہ نہیں، بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔"

۶۳۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

كُتِبَ عَلَيْكُمْ ..... حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ "كُتِبَ عَلَيْكُمْ" فرض کر دینے کے معنی میں قرآن اور کلام عرب دونوں میں معروف ہے۔ وصیت کے لفظ کی تحقیق پچھلے صفحات میں گذر چکی ہے کہ عربی میں یہ لفظ کسی بڑے کی طرف سے چھوٹوں کو تلقین و ہدایت کے معنی میں آتا ہے عام اس سے کہ یہ تلقین و ہدایت کوئی شخص اپنے آخری وقت میں کرے یا عام حالات میں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو جو ہدایات دی گئی ہیں، قرآن میں اُن کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہاں لفظ وصیت چونکہ مصدری معنی میں ہے، نہ اپنے فعل سے فاصلہ پر واقع ہے، اسی وجہ سے تذکیر و تانیث کا لحاظ نہ تو فعل میں ضروری ہوا نہ بعد کی ضمیروں ہی میں۔

اس وصیت کی فرضیت کے ساتھ دو شرطیں لگائی ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی اس وقت کرے جب اسے اپنی موت قریب ہوتی نظر آنے لگے، دوسری یہ کہ جب وہ کچھ مال اپنے پیچھے چھوڑ رہا ہو۔ پہلی شرط کا ذکر "اذا" کے ساتھ کیا ہے اس لئے کہ موت کا مرحلہ سب کو پیش آتا ہے دوسری کا ذکر ان کے ساتھ کیا ہے اس لئے کہ مال کا ہونا ہر ایک کے پاس ضروری نہیں، "ان" اور "اذا" کے استعمال کا یہ فرق عربی زبان کے طلبہ سے مخفی نہیں۔ وصیت میں یہ دونوں پہلو بڑی اہمیت رکھنے والے ہیں۔ جو لوگ اپنی چلتی پھرتی زندگی میں وصیت کر دیتے ہیں وہ بسا اوقات بڑی الجھنوں میں پڑ جاتے ہیں اور جو لوگ مال رکھتے ہوئے وصیت سے گریز کرتے ہیں وہ بسا اوقات اپنے پیچھے جھگڑے چھوڑ جاتے ہیں۔

خیر کے اصل معنی مطلوب و مرغوب شے کے ہیں اس وجہ سے علم، عقل، حکمت، عدل نیکی اور بھلائی سب کے لئے اس کا استعمال ہے۔ پھر یہیں سے یہ مال کے لئے بھی استعمال ہونے لگا اس لئے کہ مال بھی ایک مرغوب و مطلوب شے ہے۔ قرآن میں یہ لفظ کئی جگہ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے اس وجہ سے حوالہ کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن نے مال کے لئے اس لفظ کو اختیار کر کے گویا بالواسطہ اس غلط فہمی کی اصلاح کر دی ہے جو عام طور پر رہبانی تصور کے زیر اثر لوگوں میں پھیلی ہوئی تھی کہ مال فی نفسہ ایک ناپاک و نجس چیز ہے۔ اس وجہ سے اللہ والوں کے لئے اس سے آلودہ ہونا جائز نہیں۔

مَعروف کے لغوی معنی جانی پہچانی ہوئی چیز کے ہیں، یعنی جس کو عقل مانتی ہو، جو عدل پر پوری اُترتی ہو، اچھے لوگ جسے پہچانتے ہوں، سوسائٹی کے شریفوں میں جس کا چلن اور رواج ہو۔ یہ معروف بہت سے معاملات میں اسلامی قانون کا درجہ رکھتا ہے اور اس حیثیت سے قرآن میں اس کا جگہ جگہ حوالہ آیا ہے۔ اُوپر دیت کے سلسلہ میں بھی اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ قانون کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وُہ جو معروف پر مبنی ہے، دوسرا وہ جو اللہ تعالیٰ کے حکم پر مبنی ہے جس چیز کے بارے میں خدا کا قانون موجود نہ ہو اس میں معروف معتبر ہوتا ہے لیکن جس باب میں خدا کا قانون نازل ہوگیا اس میں معروف کا اعتبار ختم ہوگیا۔ اس لئے کہ سورج کے طلوع ہوجانے کے بعد ستاروں سے رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔

اس آیت میں والدین اور اقربا کے لئے جو وصیت کا حکم دیا گیا وہ معروف کے تحت تھا اور اس عبوری دَور کے لئے تھا جبکہ اسلامی معاشرہ ابھی اس استحکام کو نہیں پہنچا تھا کہ تقسیم وراثت کا وہ آخری حکم دیا جائے جو سورۂ نساء میں نازل ہوا۔ اس حکم کے نزول کے لئے حالات کے سازگار ہونے سے پہلے یہ عارضی حکم نازل ہوا اور اس سے دو فائدے پیش نظر تھے۔ ایک تو فوری طور پر ان حصہ داروں کے حقوق کا ایک حد تک تحفظ جن کے حقوق عصبات کے ہاتھوں تلف ہو رہے تھے۔ اور دوسرے اس معروف کو از سر نو تازہ کرنا جو شرفائے عرب میں زمانہ قدیم سے معتبر تھا لیکن اب وہ آہستہ آہستہ جاہلیت کے گرد و غبار کے نیچے دب چلا تھا تاکہ یہ معروف اس قانون کے لئے ذہنوں کو ہموار کرسکے جو اس باب میں نازل ہونے والا تھا۔

اس وصیت کے متعلق فرمایا کہ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ۔ حَقًّا فعل محذوف کی تاکید کے لئے ہے یعنی یہ تمام اہل ایمان پر جو خدا سے ڈرنے والے ہیں واجب اور ضروری ہے، جو اس سے گریز کریں گے ان کے سینے خوف خدا سے خالی نہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس عبوری مدت میں، جو اصل قانون وراثت سے پہلے گذری، ہر مسلمان پر اس کی تعمیل ضروری تھی، اس کی حیثیت صرف ایک نیکی اور فضلیت کی نہیں تھی۔

فَمَنْ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ ..... اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ | چونکہ اس قانون کے ٹھیک ٹھیک نفاذ کا تمام تر انحصار شاہدوں اور گواہوں کی امانت و دیانت ہی پر تھا شریعت

میں وارثوں کے حقوق کا ابھی تعین نہیں ہوا تھا، اس وجہ سے شاہدوں کی عظیم ذمہ داری واضح فرما دی کہ اگر وہ صاحب وصیت کی وصیت میں کوئی ردوبدل کریں گے تو اس کا سارا بارِ گناہ انہی کے سر ہوگا۔ اس کی کوئی ذمہ داری نہ تو صاحب وصیت پر عائد ہوگی نہ اس کو نافذ کرنے والوں پر۔ سمیع و علیم کی صفات کے حوالہ میں تبدیلی کی جسارت کرنے والوں کے لئے تنبیہہ اور دھمکی ہے کہ وہ اس بات کو یاد رکھیں کہ خدا سب کچھ سنتا اور جانتا ہے، وہ اس جرم عظیم کی سزا دیئے بغیر نہ رہے گا۔

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا ...... اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ "خوف" کے اصل معنی گمان کرنے، خیال کرنے، توقع کرنے، اندیشہ کرنے کے ہیں۔ پھر یہیں سے یہ ڈرنے کے معنی کے لئے استعمال ہونے لگا۔ ایک حماسی شاعر کا شعر ہے۔

ولو خفت انی ان کففت ـــــ تحیتی
تنکب عنی رھت ان یتنکبا

اگر مجھے توقع ہوتی کہ اگر میں بڑھاپے کا خیر مقدم نہ کروں گا تو وہ مجھ سے رک جائے گا تو میں اپنے خیر مقدم سے باز رہ کر اس کو روکنے کی کوشش کرتا۔

یہاں زیر بحث آیت میں یہ لفظ اندیشہ، گمان اور علم ہی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ صاحب کشاف نے اس معنی کی طرف اشارہ تو کیا ہے لیکن اس کی کوئی دلیل نہیں دی ہے۔ ہم نے اس کی دلیل پیش کر دی ہے۔

"جَنَفٌ" کے اصل معنی مائل ہونے کے ہیں لیکن اس کا غالب استعمال نیکی اور حق سے ہٹ کر برائی اور ناانصافی کی طرف مائل ہونے کے لئے ہے۔ آیت میں یہ بیجا پاسداری اور ناروا جانبداری کے لئے استعمال ہوا ہے۔

"اثم" میں اصلاً تاخر یعنی پیچھے رہ جانے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ چنانچہ آثمہ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو قافلہ میں تھک جانے کی وجہ سے پیچھے رہ جائے۔ پھر یہ لفظ ادائے حقوق میں پیچھے رہ جانے کے لئے استعمال ہوا، عام اس سے کہ وہ خدا کے حقوق ہوں یا بندوں کے۔ اپنے اس مفہوم کے لحاظ سے یہ "بر" کا ضد ہے اس لئے کہ "بر" کا اصل مفہوم، جیسا کہ ہم آیت ۱۷۷

کے تحت واضح کر چکے ہیں، ایفائے حق ہے۔ یہ لفظ "عدوان" کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے اس لئے کہ حقوق کے معاملہ میں گناہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک کوتاہی اور حق تلفی کی نوعیت کے دوسرے دست درازی اور تعدی کی نوعیت کے۔ پہلی قسم کے لئے اثم کا لفظ ہے، دوسری کے لئے عدوان کا۔ آیت زیر بحث میں یہ لفظ جنف کے ساتھ استعمال ہوا ہے جنف کے معنی ہم واضح کر چکے ہیں کہ جانبداری کے ہیں اس کے بالمقابل اثم کا ٹھیک مفہوم حق تلفی کا ہوگا۔ اور ایک نامنصف وصیت کرنے والے سے انہی دونوں باتوں میں سے کسی ایک بات کا اندیشہ ہو سکتا ہے یا تو وہ وارثوں میں سے کسی ایک کی جانبداری کرے گا یا کسی کی حق تلفی کا مرتکب ہوگا۔

اُوپر والی آیت میں وصیت کرنے والے کی وصیت میں کسی تبدیلی کرنے کی نہایت شدت کے ساتھ ممانعت فرمائی گئی تھی اب اس آیت میں یہ ارشاد ہوا کہ تبدیلی کی یہ ممانعت اصلاح کی ممانعت کے ہم معنی نہیں ہے۔ اگر کسی وصیت کرنے والے کے اندر جانبداری یا حق تلفی کا رجحان محسوس ہو رہا ہے یا اس کی وصیت واضح طور پر جانبداری اور حق تلفی کا پہلو لئے ہوئے ہے تو وصیت کے گواہوں کی طرف سے اس جانبداری اور حق تلفی کی اصلاح کی کوشش اس تبدیلی کے حکم میں نہیں ہے جس کی ممانعت کی گئی ہے بلکہ یہ چیز جائز ہے۔ البتہ یہ اصلاح انہیں بطور خود کر دینے کا حق نہیں ہے بلکہ اس کے لئے انہیں فریقوں کے درمیان سمجھوتے اور مفاہمت کی راہ اختیار کرنی چاہیئے۔ اگر اس کا موقع ہے کہ خود وصیت کرنے والے کو سمجھا بجھا کر عدل و انصاف کی راہ اختیار کرنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے تو یہ راہ اختیار کی جائے ورنہ بصورت دیگر وارثوں کے درمیان مفاہمت کرانے کی کوشش کی جائے۔ یہ مفہوم فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ کے الفاظ سے نکلتا ہے۔ اس لئے کہ ان الفاظ کا واضح مفہوم ان کے درمیان مصالحت کرا دینا ہے نہ کہ بطور خود کوئی اصلاح کر دینا۔

۶۴۔ آگے کا سلسلۂ کلام آیات (۱۸۳-۱۸۷)

حرمت جان اور حرمت مال کے مذکورہ بالا قوانین کے بعد اب یہ روزے اور اس سے متعلق احکام بیان ہو رہے ہیں۔ ہماری معروف فقہی ترتیب کے لحاظ سے تو روزہ عبادات کی فہرست میں شامل ہے اس وجہ سے خیال دل میں یہ گذرتا ہے کہ اس کا ذکر اوپر کی اس آیت کے ساتھ ہونا تھا جس میں نماز اور انفاق کا ذکر ہے لیکن قرآن حکیم میں احکام کے بیان کی ترتیب وہ نہیں ہے جو

ہماری فقہ کی کتابوں میں ملحوظ رکھی گئی ہے بلکہ حکمت شریعت، اصلاح معاشرہ، تزکیہ نفوس اور رعایت احوال کے تقاضوں کے تحت ہے۔ ان پہلوؤں سے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ حرمت جان وحرمت مال کے قوانین کے بعد یہ روزے کا بیان اس عبادت کو سامنے لا رہا ہے جو ضبطِ نفس اور تربیت تقویٰ کے لئے اسلام نے مقرر کی ہے تاکہ طمع اور اشتعال، لالچ اور انتقام خواہش اور ہیجان کے غیر معتدل رجحانات وداعیات کو انسان لگام لگا سکے اور اپنے بے مہار نفس کو اس راستہ پر ڈال سکے جو تقویٰ کا راستہ ہے۔ روزہ صبر اور تقویٰ پیدا کرنے کی خاص عبادت ہے اور یہی صفات ہیں جو انسان کو دست درازی اور حق تلفی سے بچاتی بھی ہیں اور بر و احسان اور حق و عدل کے قیام پر اُبھارتی بھی ہیں۔ چنانچہ یہاں روزے کا حکم جس طرح پچھلے احکام پر عمل کے لئے تربیت کی بنیاد قائم کرتا ہے اسی طرح اس کے بعد جو احکام رشوت دہی کی ممانعت اور حج و جہاد سے متعلق آرہے ہیں ان کے لئے بھی صبر کی اساس فراہم کرتا ہے۔ گویا ترتیب میں اس کے موقع و محل ہی نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ روزہ اسلام میں کیوں فرض کیا گیا اور اس کے مقاصد و فوائد کیا ہیں، زندگی کن پہلوؤں سے اس سے متاثر ہوتی ہے اور پھر حیات اجتماعی پر اس کے اثرات کیا پڑتے ہیں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ ۚ وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ۝

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ ۖ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۝

اے ایمان والو، تم پر بھی روزہ فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے والوں پر فرض کیا گیا تھا۔ تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو۔ گنتی کے چند دن۔ اس پر بھی جو کوئی مریض ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں تعداد پوری کر دے۔ اور جو لوگ ایک مسکین کو کھانا کھلا سکیں ان پر ایک روزے کا بدلہ ایک مسکین کا کھانا ہے۔ جو کوئی مزید نیکی کرے تو وہ اس کے لئے بہتر ہے۔ اور یہ کہ تم روزہ رکھو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے، اگر تم سمجھو۔

رمضان کا مہینہ ہے کہ جس میں قرآن اتارا گیا لوگوں کے لئے ہدایت بنا کر اور ہدایت اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کے کھلے دلائل کے ساتھ، سو جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو وہ اس کے روزے رکھے۔ اور جو بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرلے۔ اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے، تمہارے ساتھ سختی نہیں کرنا چاہتا۔ اور چاہتا ہے کہ تم تعداد پوری کرو اور اللہ نے جو تمہیں ہدایت بخشی ہے اس پر اس کی بڑائی کرو اور تاکہ تم اس کے شکر گزار بنو۔

اور جب میرے بندے تم سے میرے متعلق سوال کریں تو میں قریب ہوں۔ میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔ تو چاہیئے کہ وہ میرے حکم مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں۔ تاکہ وہ صحیح راہ پر رہیں۔

تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جانا جائز کیا گیا ہے وہ تمہارے لئے بمنزلہ لباس ہیں اور تم ان کے لئے بمنزلہ لباس ہو۔ اللہ نے دیکھا کہ تم

اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے تو اس نے تم پر عنایت کی اور تم سے درگزر فرمایا تو اب تم ان سے ملو اور اللہ نے تمہارے لئے جو مقدر کر رکھا ہے اس کے طالب بنو۔ اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ فجر کی سفید دھاری شب کی سیاہ دھاری سے نمایاں ہو جائے۔ پھر رات تک روزہ پورا کرو۔ اور جب تم مسجد میں اعتکاف میں ہو تو بیویوں سے نہ ملو۔ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں تو ان کے پاس نہ پھٹکنا۔ اس طرح اللہ اپنی آیتیں لوگوں کے لئے واضح کرتا ہے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔

المنبر ہمیشہ سے دعوت الی اللہ اور اظہارِ حق کے لئے وقف

آپ المنبر کا مطالعہ فرمائیے "المنبر" کا ہر شمارہ

○ اسلام کی بے لاگ اور فرقہ واریت سے پاک دعوت

○ اسلام کے خلاف سازشوں کی بے نقابی

○ دین میں تحریف و ترمیم کے فتنہ کی سرکوبی اور اسلامیانِ عالم کو اسلام کے کلمہ جامعہ پر متحد کرنے کی مساعی کا حامل ہوتا ہے۔

طرزِ بیان شگفتہ — استدلال واضح

سالانہ چندہ: پانچ روپے

ایک پرچہ: تیرہ نئے پیسے

اور سوز و حرارت سے بھرپور مقالات

المنبر کی خصوصیات ہیں

پرچہ ہر بدھ کو شائع ہوتا ہے۔ سال بھر میں متعدد خصوصی نمبر اہتمام سے شائع ہوتے ہیں

پتہ: ہفت روزہ "المنبر" پوسٹ بکس نمبر ۱۰۱ - ۹۴۳ جناح کالونی لائلپور

افاداتِ فراہیؒ

جناب خالد مسعود صاحب

شریعت کی بنیاد اور اسکا مقصد

خدا کی شریعت انسان کے ان اخلاق پر مبنی ہے جو اس کی فطرت کے اندر ودیعت ہیں، مثلاً شکر، عدل اور احسان۔

وہ چیز جس سے تمام مکارم اخلاق پیدا ہوتے ہیں اور جو ان کا فلسفہ اور روح ہے، آدمی کی اپنے رب کے ساتھ نسبت ہے۔ اس نسبت کی پہلی صورت محبت اور شوق ہے جس کے بعد رب کریم کی نعمتوں اور اس کی رأفتوں کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اور اس کے بالمقابل اپنا افلاس اور درماندگی کھل کر سامنے آتی ہے۔ یہیں سے شکر کی بنیاد پڑتی ہے جو انسان کا سب سے پہلا فریضہ ہے۔

خدا کی رافت و رحمت کے نتیجہ میں خلق سے محبت پیدا ہوتی ہے، اس محبت کا تقاضا یہ ہے کہ دوسروں کے مقابل میں انسان اپنے آپ کو ترجیح نہ دے۔ یہ عدل ہے۔ اگر انسان کی فطرت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس پر کئی حقوق واجب ہیں، جن کی ادائیگی وہ لوگوں کی ملامت کے خوف سے یا حکومت کی سزا اور خدا کے عذاب سے ڈر کر یا محض عادتاً کرنے پر مجبور نہیں بلکہ یہ خطرات اگر نہ بھی ہوں جب بھی وہ ان حقوق کو لازم سمجھ کر ادا کرے گا فطرت کے اس حکم کی تعبیر عدل سے کی جاتی ہے جو کسی خاص حق کو نہیں بلکہ تمام حقوق کو محیط ہے اور جہاں بھی کوئی حق ہوگا وہ عدل کا محل ہوگا۔ عدل کی بنیاد چونکہ حق پر ہے اس لئے بندے اپنے رب کا شکر ادا نہ کر سکتے تھے جب تک خدا پر ان کا حق نہ ہو جاتا۔ سو اللہ جل شانہٗ نے محض اپنی مہربانی سے ان کا حق ٹھہرا دیا۔

اسی عدل کا ایک پہلو وہ بھی ہے جو دوسروں کے حقوق کے علاوہ ہے۔ اور وہ ہے اس حق کی ادائیگی جو خود آدمی کے اندر ہے۔ آدمی کا مال اور اس کی جان چونکہ خدا کی بخشی ہوئی ہے اس لئے ان پر آدمی کا مجرد حق نہیں ہے۔ اس لحاظ سے عدل یہ ہوگا کہ آدمی کا عمل اس کی ذات کے حق کے ساتھ موافقت رکھتا ہو اسی بنا پر آخرت میں بندوں سے ان کے تمام افعال کے بارے میں سوال ہوگا۔

خلق کی محبت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ آدمی دوسروں کے ساتھ عدل کرنے ہی پر اکتفا نہ کرے بلکہ ان پر فضل بھی کرے۔ یہ احسان کا درجہ ہے۔ بندوں پر احسان خدا کی نعمتوں کا شکر بھی ہے جس پر احسان ہوا اس کے لحاظ سے تو یہ احسان ہے لیکن خدا کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ اس کا شکر ہے۔ جہاں تک احسانِ محض کا تعلق ہے وہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کے لئے نہیں۔ احسان چونکہ واجب نہیں اس لئے یہ حق کے علاوہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے چونکہ رحمت اپنے اوپر واجب ٹھہرالی ہے، یہ اس کا ایک مزید احسان ہے۔

دوسرے اعتبار سے غور کیا جائے تو آدمی کی اپنے رب کے ساتھ نسبت کا ایک پہلو اس سے دُوری کا احساس ہے جس سے خدا کا خوف اور تقویٰ وجود میں آتے ہیں۔ اس سے آگے کی منزل تعبد اور سپردگی کی ہے اور اس کے بعد خدا کی کامل اطاعت کا مقام آتا ہے۔

سلبی پہلو سے دیکھا جائے تو یہی تقویٰ شریعت کی بنیاد ہے۔ یہی گناہوں سے روکنے والا اور نیکی کا حکم دینے والا ہے۔ خداوند کریم کا ارشاد ہے۔

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ وَهُوَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝

کہہ دو کہ اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے اور ہمیں حکم ہوا ہے کہ ہم رب العالمین کے آگے سرفگندہ ہوں اور یہ کہ نماز قائم کرو اور اسی سے ڈرو اور وہی ہے جس کی طرف تم اکٹھے کئے جاؤ گے

اس آیت میں پہلے اسلام کا اجمالی حکم دیا پھر رغبت و خوف کے دونوں احساسات کے ساتھ خدا کا ذکر کرنے کا تفصیلی حکم دیا۔ اس کے بعد اس چیز کو بیان کیا جو اسلام اور ذکر الٰہی کا باعث بنتی ہے، یعنی خدا کی طرف لوٹنے کا یقین۔ گویا معاد کا یقین نماز اور تقویٰ کی طرف لے جاتا ہے، نماز رب سے قریب کرتی ہے اور تقویٰ اس کے غضب سے دُور کرتا ہے۔ تقویٰ اس حقیقت کے

اعتراف ویقین سے پیدا ہوتا ہے کہ پروردگار ہمارے افعال سے واقف ہے اور نماز اس حقیقت کی یاد دہانی کا نتیجہ ہوتی ہے کہ پروردگار کی رحمت ہمارے اُوپر ہے۔

اُوپر کی تفصیل سے یہ بات واضح ہے کہ شریعت کے تمام اوامر و نواہی ان فطری اخلاق کی تعبیریں جو ہمارے نفوس کے اندر پائے جاتے ہیں۔ اسی لئے وہ تمام اوامر و نواہی جن کی بنیاد ہماری فطرت میں نہیں ہے نفس پر ظلم اور خدا کی تخلیق کا بگاڑ ہیں۔ ان کی حیثیت فساد فی الارض کی ہے اور نیکی کی راہوں سے ان کا دُور کا بھی واسطہ نہیں۔

شرائع کا مقصد احکام شریعت کا اصل مقصد تزکیۂ نفوس ہے۔ جس طرح شرائع ہمارے اخلاق پر مبنی ہیں اسی طرح یہ ان اخلاق کو درجۂ کمال تک پہنچانے کے لئے نفس کی تربیت کا بھی ذریعہ ہیں اور یہی تزکیہ کا مقصود بھی ہے۔ اگر یہ اخلاقی تربیت علم و بصیرت کے ہمراہ ہو تو اس کو حکمت کہیں گے کیونکہ حکمت علم اور اخلاق کے تحت ہے اور حکیم وہ ہے جو عالم بھی ہو اور مہذب بھی۔

محاسن اخلاق فطری ہونے کی وجہ سے لوگوں کو معلوم ہیں ان کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ انہی کی بنا پر لوگ ایک دوسرے کی تعریف کرتے ہیں، ایک شخص دوسرے کو محبوب رکھتا ہے، ہر شخص چاہتا ہے کہ انہی محاسن کے ساتھ پہچانا جائے اور انہی کی بدولت اس کا ذکر باقی رہے۔ ان اخلاق کے بارے میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ علم کے ساتھ جذبات کی آمیزش، حق کے ساتھ باطل کے امتزاج اور اصلاح میں فساد کی دراندازی کا نتیجہ ہے۔ اس اختلاف کی حکمت یہ ہے کہ اس دارفانی میں آدمی اپنے نفس کو سنوارنے کی جدوجہد کرے اور اپنے عمل کی بدولت ترقی حاصل کرے۔ وحی نفسِ انسانی ہی کی تعمیر، ازالۂ جہالت اور خواہش کے مرض سے نجات دینے کے لئے علم و عمل کے دو نسخے یعنی عقائد و شرائع لے کر آتی۔ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو ان کی فطرت کے تقاضوں کی یاد دہانی کی گئی اور جس جبلت پر وہ پیدا ہوئے تھے، اس کو ان پر فرض ٹھہرا دیا گیا۔ اسی لئے وہ تمام اشخاص جو فطرت سے قریب ترین تھے وحی کو سب سے پہلے ماننے والے بنے۔

فَالسَّابِقُوْنَ السَّابِقُوْنَ اُولٰٓئِكَ سبقت کرنے والے آگے ہوں گے۔ وہی

الْمُقَرَّبُوْنَ مقرب ہوں گے۔

جس طرح عقل سے یہ ظاہر ہے کہ شرائع محاسن اخلاق کے کمال کی طرف رہنمائی کرتی ہیں اسی طرح وحی سے بھی یہی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ ذیل کی آیت ملاحظہ ہو۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ

اے ہمارے رب ان کے اندر انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمائیو جو ان پر تیری آیات پڑھے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔

اس آیت میں یہ بتایا کہ نبی لوگوں کو قرآن سناتا ہے، ان پر جو شریعت فرض کی گئی ہے اس کی اور اس حکمت وبصیرت کی تعلیم دیتا ہے جو احکام شریعت میں ہے اور نتیجۃً ان کا تزکیہ کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دوسری آیت ہے۔

كَمَا اَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنْكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ اٰيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ

جیسا کہ ہم نے تمہارے اندر تمہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تم کو اس کی آیات سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

مذکورہ آیات میں سے ایک آیت میں تزکیہ کا ذکر ابتدا میں اور دوسری آیت میں آخر میں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تعلیم کتاب وحکمت کی غایت تزکیہ ہے جو قصد وارادہ میں پہلے مقصود ہوتا ہے لیکن نتیجۃً آخر میں حاصل ہوتا ہے۔

آیت:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا

وہ کامیاب ہوا جس نے (نفس کو) نشوونما دی اور وہ رسوا ہوا جس نے اس کو آلودہ کیا۔

میں بھی تزکیہ سے صلاحِ نفس کو تعبیر کیا اور اسی کو آخری ہدف قرار دیا۔ دَسّٰهَا کا لفظ استعمال کر کے نفس کا فساد مراد لیا۔

خود لفظ "تزکیہ" میں بھی اس بات کی دلالت موجود ہے کہ محاسن اخلاق کی جڑیں خود نفس

انسانی کی فطرت میں ہیں کیونکہ تزکیہ کا مطلب ہے ایک شے کو تمام آلودگیوں سے پاک کر کے اس کے اصل عنصر کی طرف لوٹانا۔ قرآن نے اس کی تصریح فرمائی۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنَاہُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَھُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ○

بیشک ہم نے انسان کو اچھی ساخت پر پیدا کیا پھر ہم نے اس کو پست ترین مقام تک لوٹا دیا سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح کئے تو ان کے لئے غیر مقطوع اجر ہوگا۔

یعنی یہ کہ مومنین چونکہ نفس کی آلودگیوں سے ملوث نہیں ہوئے اور اپنی جدوجہد کی غایت کو پہنچے اس لئے وہ نعمتوں میں ہمیشہ رہیں گے اور وہاں سے کبھی نکالے نہ جائیں گے۔

آزمائش کے لئے نازل شدہ احکام

احکام شریعت کا اصل مقصد تو جیسا کہ معلوم ہو چکا، تزکیہ نفس ہے لیکن کبھی کبھی ایسے احکام کے نزول کی ضرورت ہوتی ہے جو اگرچہ مقصود بالذات نہیں ہوتے لیکن فرمانبردار اور نافرمان لوگوں یا کمزور ایمان اور مضبوط ایمان رکھنے والوں کے درمیان فرق کرنے کے لئے ان کی حاجت ہوتی ہے۔ یہ معلوم رہنا چاہیئے کہ باطن ظاہر پر اپنے اثرات ڈالتا ہے جس طرح آدمی کی نبض، اس کی آنکھ، زبان اور منہ سے اس کی صحت یا بیماری کے متعلق نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے اسی طرح روزہ و نماز میں اس کی رغبت سے اس کے دل کی سلامتی یا خرابی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ بیماریوں کے علاج اور مفاسد کی اصلاح کے لئے ان اثرات کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ جہاں تک نفس کا معاملہ ہے، اس کا فساد بہت مخفی قسم کا ہوتا ہے اور صرف واقعات ہی سے اس پر تنبہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً یہ بات کہ کوئی شخص بزدل ہے یا بہادر، خائن ہے یا ناشکرا، اس وقت تک معلوم نہیں ہوتی جب تک کہ آزمائش کی آگ اسے تپا نہ دے۔ آزمائش کے نتیجہ میں آدمی اپنے حال پر ٹھیک مطلع ہو کر اس کی اصلاح کرتا ہے۔ گویا ظاہری صورت حقیقت کے حصول کا ذریعہ بنتی ہے۔ لیکن یہ مقصد اسی وقت پورا ہوتا ہے جب آدمی معنی کی طرف توجہ کرے اور احکام شریعت کی غایت کو سمجھتا ہو۔ طالوت کا اپنے لشکر کو نہر کا پانی پینے سے منع کرنے کا حکم اور یہود کو حطۃ کی دعا مانگنے

کا حکم انہی ابتلائی احکام کے قبیل سے ہیں۔ طالوت نے جو حکم دیا اس کا منشا اہل استقامت کو ان لوگوں سے الگ کرنا تھا جن کا جماعت مجاہدین میں شامل رہنا نقصان دہ تھا۔ اسی طرح کا حکم مسلمانوں کو دیا جس کا منشا یہ تھا کہ حجاج کی جماعت سے فاسقین کو الگ کیا جائے فرمایا۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهٗٓ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔

(مائدہ ۹۴)

اے ایمان والو، اللہ تمہیں کچھ شکار سے ضرور آزمائے گا جس کو تمہارے ہاتھ اور نیزے پہنچیں گے یہ اس لئے کہ اللہ ان لوگوں کو متعین کرے جو غیب میں رہتے ہوئے اس سے ڈرتے ہیں۔ تو جس شخص نے اس کے بعد زیادتی کی اس کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔

کبھی کبھی شریعت کے کسی حکم میں بھی ابتلا پایا جاتا ہے اگرچہ وہ حکم مقصود بالذات ہوتا ہے۔ اس کی مثال تحویل قبلہ کا حکم ہے۔ فرمایا

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ۔

(بقرہ ۱۴۳)

اور ہم نے وہ قبلہ کہ جس پر تو تھا، نہیں ٹھہرایا مگر اس لئے کہ ہم جانیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اس شخص سے جو پیچھے پھر جاتا ہے۔

قبلہ کی تبدیلی کے اس حکم کے نتیجہ میں مسلمانوں کی جماعت میں سے کئی منافقین الگ ہو گئے اس تفریق کی حاجت اس وقت ہوئی جب مسلمانوں کو غاصب کفار کے قبضہ سے خانہ کعبہ کو چھڑانے کے لئے قتال کرنے کا حکم دیا گیا۔

اس طرح کے احکام کی دوسری مثال نسخ بدعات ہے جو نزول قرآن کے نتیجہ میں واقع ہوا۔ اس کے متعلق فرمایا کہ منافقین اور کھلم کھلا مخالفت کرنے والے یہود کے لئے اس کو آزمائش بنایا گیا۔ سورۂ حج میں ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰى

اور ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا مگر شیطان نے اس کے حوصلوں میں

اَلْقَى الشَّيْطَانُ فِیْ اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِى الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِى الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِلَّذِيْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَرَضٌ وَالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِیْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ ٥ (حج ۵۲، ۵۳)

اڑنگے ڈالے پس شیطان جو کچھ ڈالتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو منسوخ کر دیتا ہے۔ پھر وہ اپنی آیتوں کو مضبوط کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ علم و حکمت رکھنے والا ہے۔ یہ اس لئے کہ شیطان جو کچھ ڈالتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو آزمائش بنائے ان لوگوں کے لئے جن کے دلوں میں بیماری ہے اور انکے لئے جن کے دل سخت ہو گئے ہیں۔ بیشک ظالم پرلے درجے کی مخالفت میں ہیں۔

یہ ابتلا اسی عام ابتلا کا ایک شعبہ ہے جو زندگی کا مقصود ہے اور اس میں تربیت و تزکیہ کی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔

آزمائش کے مقصد سے جو احکام شریعت نے دیئے ہیں ان کو بعض لوگ تعبدی احکام کا نام دے دیتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کی حکمت نامعلوم ہے۔ لیکن جاننا چاہیئے کہ ان احکام کی نوعیت الگ ہے اور جب ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ ان کے اندر ابتلا کا کوئی مقصد پوشیدہ ہے تو اسی پر اکتفا کرنا چاہیئے اور ہر وہ حکمت ان کے تحت داخل نہ کرنی چاہیئے جو ہم پر مخفی ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ اس نوعیت کے احکام چند ایک ہیں اور ان میں سے بیشتر کسی خاص وقت سے متعلق ہیں مثلاً حِطَّةٌ کہنے کا حکم، نہر کا پانی پینے سے روکنے کا حکم اور سابق شریعتوں کی منسوخی۔ کامل و دائم شریعت ایسے احکام کی متقاضی تھی جن کا فائدہ دائمی ہو۔ اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گذشتہ اُمتوں کے وہ احکام ساقط کر دیئے جن میں فائدہ کم تھا اور جو محض ترغیب و تحریص کے مقصد کے تحت نازل کئے گئے تھے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ٥ (مائدہ ۶)

اللہ تمہارے اوپر تنگی کرنا نہیں چاہتا بلکہ وہ تمہیں پاک کرنا اور تمہارے اوپر اپنی نعمت تمام کرنا چاہتا ہے تاکہ تم شکر گزار ہو۔

مراسلہ ومذاکرہ

امین احسن اصلاحی

عقائد وعبادات کا تعلق تعمیر سیرت سے

جولائی ۶۳ء کے میثاق میں تفسیر کی جو قسط شائع ہوئی ہے اس میں آپ نے سیرت وکردار کو عقائد وعبادات کا مقصد اعلیٰ قرار دیا ہے اس سے قبل تفسیر ہی کی ایک قسط میں یہ بات بیان ہوئی تھی کہ انبیاء کرام کے مشن کا منتہا یہ ہے کہ وہ تزکیہ نفوس کرتے ہیں۔ اگر حقیقت یہی ہے تو کیا ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد سیرت وکردار کی تعمیر قرار دینا صحیح ہوگا، جبکہ عام تصور یہ ہے کہ آیت مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ کی رُو سے انسان کی زندگی کا مقصد خدا کی عبادت ہے؟

موجودہ نفسیات کی روشنی میں انسان کا مقصد حیات یہ ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی شخصیت (Personality) کی تعمیر (Development) کرے۔ علمائے نفسیات کے نزدیک لفظ "شخصیت" آدمی کے نظریات و اعمال سب پر حاوی ہے۔ اس لحاظ سے ان کے نزدیک "تعمیر شخصیت" کا مفہوم گویا یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے نظریات وعقائد اور اپنے اعمال وافعال میں بہتر سے بہتر مقام پر پہنچنے کی کوشش کرے۔ اسلام میں عقائد وعبادات کا مقصود اعلیٰ اگر سیرت وکردار ہے تو کیا دور حاضر کے علمائے نفسیات کی مذکورہ تقریر سے آپ اتفاق کرتے ہیں؟

جواب: - یہ بات کہ انسان کی زندگی کا مقصد خدا کی عبادت ہے، اس بات سے تضاد نہیں رکھتی کہ انبیاء کی بعثت کا مقصود تزکیہ نفوس ہے یا یہ کہ عبادات و عقائد سے مقصود اعلیٰ سیرت و کردار کو نشو و نما دینا ہے۔ یہ ساری باتیں ایک ہی سلسلہ کی مربوط کڑیاں ہیں۔

خدا کی عبادت اس اعتبار سے تو بلاشبہ انسانی زندگی کا اصل نصب العین ہے کہ سب سے بڑا حق واجب از روئے عقل و فطرت و از روئے دین و شریعت انسان پر یہی ہے۔ لیکن یہ حقیقت آپ جیسے اصحاب فکر و نظر سے مخفی نہیں ہو سکتی کہ خدا کی عبادت اس لئے مطلوب نہیں ہے کہ خدا اس کا محتاج ہے بلکہ اس لئے مطلوب ہے، کہ ہم اس کے محتاج ہیں۔ اسی چیز سے ہماری زندگی کو حقیقی ارتقاء کے لئے وہ سہارا ملتا ہے جس سے ہماری وہ تمام عقلی و روحانی اور تمام علمی و عملی صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں جو ہمارے اندر قدرت نے ودیعت کی ہیں۔ اگر یہ سہارا میسر نہ آئے تو اول تو ہماری زندگی کی اصلی صلاحیتیں بالکل مسکڑ کے رہ جاتی ہیں۔ اور اگر کچھ پھیلتی بھی ہیں تو غلط سہارے پکڑ لینے کے سبب سے بالکل غلط سمتوں میں پھیل جاتی ہیں۔ اگر عبادت الٰہی (واضح رہے کہ عبادت کا لفظ میں اس کے حقیقی اور وسیع معنوں میں لے رہا ہوں) اصلی نصب العین کی حیثیت سے پیش نظر رہے تو زندگی اس قسم کی کوتاہیوں اور کجرویوں سے محفوظ رہنے کی وجہ سے اس پودے کی مانند پروان چڑھتی ہے جس کو زمین اور فضا دونوں سے بھرپور غذا حاصل ہو رہی ہے۔

انبیاء علیہم السلام تزکیہ نفوس کی جو خدمت انجام دیتے ہیں اس میں ان کا پہلا کام ہوتا ہے کہ وہ ہماری زندگی کے رخ کو خدا کی طرف سیدھا کرتے ہیں۔ اس کو صحیح کرنے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ ہمارے عقائد و نظریات ہر قسم کی کجرویوں اور ضلالتوں سے بالکل محفوظ ہو کر توحید خالص کی چٹان پر اس طرح قائم ہو جائیں کہ فساد علم و نظر کی کوئی آندھی ان کو ان کی جگہ سے ہلا نہ سکے۔ دوسری یہ کہ ہمارے اعمال و اخلاق جذبات و خواہشات کی اندھی پیروی سے آزاد ہو کر اعلیٰ عقائد و نظریات یا بالفاظ دیگر ہمارے اصلی نصب العین (خدا پرستی) سے بالکل ہم آہنگ ہو جائیں۔

اس روشنی میں دیکھئے تو یہ حقیقت بالکل واضح ہو کر سامنے آجائے گی کہ انسانی زندگی کے صحیح ارتقاء کا انحصار اس امر پر ہے کہ اس کا رخ پوری یکسوئی کے ساتھ خدا کی طرف ہو جائے اس نصب العین

کے حصول میں عقائد و عبادات، انسان کے سب سے بڑے معاون ہیں اور چونکہ ان میں سے کسی چیز کو بھی اس لئے ضروری نہیں ٹھہرایا گیا ہے کہ خدا کو اس کی ضرورت ہے اس لئے کہ خدا ہر قسم کی ضرورت سے مستغنی ہے اس وجہ سے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان ساری چیزوں سے خود انسان ہی کی ذات کی تکمیل ہوتی ہے اور ان عقائد و عبادات سے وہ اپنے آپ کو ان مکارم اخلاق سے آراستہ کرتا ہے جو اس کو خلق اور خالق دونوں سے صحیح نسبت بخشنے والے ہوتے ہیں۔

آپ نے علمائے نفسیات کے جس نقطہ نظر کا حوالہ دیا ہے بجائے خود اس سے اختلاف کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ بات تو قرآن میں بھی ہے کہ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اپنے نفس یا بالفاظ دیگر اپنی ذات اور شخصیت کی اصلاح و تعمیر ہی انسان کا اصل مقصد ہونا چاہیئے۔ یہی چیز ہے جس کے متعلق قیامت کے دن اس سے مؤاخذہ ہوتا ہے اور اسی چیز سے متعلق اس کو ایک حد تک اختیار ملا ہوا ہے البتہ یہ سوال ہمارے اور ان علمائے نفسیات کے درمیان نخلافی اور نزاعی ہے کہ انسان کی شخصیت کی تعمیر کا یہ نصب العین حاصل کس طرح ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب ہمارے نزدیک یہی ہے کہ اس کا صحیح طریقہ وہی ہے جو حضرات انبیاء علیہم السلام نے اختیار فرمایا ہے، اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ ایسا نہیں ہے جو خطرات سے محفوظ ہو۔ میں نے اس مسئلہ پر اپنی کتاب تزکیۂ نفس میں تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اُمید ہے وہ آپ نے پڑھی ہوگی۔

مقالات

چوہدری محمد اسلم صاحب چیمہ

ہبہ علی الاولاد کے مسئلہ پر ایک نظر

ہمارے ملک میں مدت سے شریعت ایکٹ نافذ ہے جس کی رُو سے تقسیم وراثت میں شریعت اسلامی کی ہدایات کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔ شریعت ایکٹ کے نفاذ سے قبل انگریزی قانون کے تحت لوگوں پر تقسیم وراثت کے سلسلہ میں اس طرح کی کوئی پابندی عائد نہ تھی، وہ جس طرح چاہتے تھے اپنی اولاد میں جائداد کو تقسیم کرتے تھے۔

مدتوں تک ہندو رسم و رواج سے متاثر ہونے کی وجہ سے ہمارے بعض مسلمانوں میں بھی یہ جاہلی تصور پیدا ہو گیا کہ ترکہ میں لڑکیوں کا کوئی حصہ نہیں اور تمام جائداد مرنے والے کی اولاد ذکور ہی میں تقسیم ہونی چاہیئے۔ حالانکہ اسلامی شریعت اپنی اس تعلیم میں بالکل واضح ہے کہ ترکہ میت کی لڑکیوں اور لڑکوں میں ایک مخصوص نسبت سے تقسیم ہوگا اور اس نسبت سے الگ کسی اصول کو مشعل راہ بنانے کا مطلب حدود اللہ کو توڑنا ہے۔

شریعت ایکٹ کے نفاذ کے باوجود بعض لوگ اپنے ان جاہلی تصورات کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ انہوں نے لڑکیوں کو جائداد کے حصہ سے محروم کرنے کے لئے حیلہ سازی کا سہارا لیا ہے۔ اس مقصد کے لئے فقہا کا یہ اصول کہ "ہبہ علی الاولاد اگرچہ عند اللہ گناہ ہے مگر قانوناً جائز ہے" ان لوگوں کے ہاتھوں میں ایک حربہ کا کام دے رہا ہے۔ وہ اپنی زندگیوں ہی میں اپنی جائداد کو اولاد کے درمیان اپنی مرضی اور پسند کے مطابق تقسیم کر دیتے ہیں تاکہ شریعت ایکٹ کا سامنا کرنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ ہبہ کی صورت میں اولاد کے درمیان اس طرح کا ترجیحی سلوک اسلامی

اصول عدل کے بالکل منافی ہے۔ حصوں کی کمی و بیشی یا بعض اولاد کی محرومی سے ایک طرف قطع رحم کا گناہ لازم آتا ہے اور دوسری طرف قریبی اور رحمی رشتوں کے درمیان فساد کا بیج بو یا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں بھائی بھائی کا دشمن ہو جاتا ہے۔

ہبہ علی الاولاد میں عدم تسویہ (عدم مساوات) سے بے شمار قباحتیں رونما ہوتی ہیں جو انتہائی سنگین، قابل مواخذہ اور نا قابلِ برداشت ہیں۔ اس لئے ہبہ علی الاولاد کے قانون کا گہری نظر سے مطالعہ ضروری ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شریعت نے صاحب جائداد کو جائداد پر تصرف کے وسیع اختیارات دے رکھے ہیں اور غیر اسلامی قوانین کے بالمقابل اسلامی قانون کی یہ ایک بہت بڑی خوبی ہے لیکن اس اختیار کا مطلب یہ ہے کہ مالک جائداد اپنی جائداد میں بیع یا رہن کے ذریعہ تصرف کر کے اپنی ذاتی ضروریات پوری کر سکے اور ورثا اسکی راہ میں حائل نہ ہوں۔ یا اگر وہ کسی غیر وارث کو بطور عطیہ کچھ دینا چاہے تو دے سکے، ورثا اُس کے لئے سدراہ ثابت نہ ہوں۔ لیکن اختیار کے اس اصول سے ہبہ علی الاولاد کا وہ حکم نکالنا جس سے شریعت کے مقرر کردہ ورثا کے حقوق ہی میں افراط و تفریط ہونے لگے، نہ صرف اخلاق سوز ہے بلکہ قرآن کی واضح ہدایت يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ (تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تم کو وصیت کرتا ہے مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصوں کے برابر ہے) کے بھی منافی ہے۔

اس آیت کا مطلب بالکل صاف ہے۔ جب کوئی صاحب جائداد، اپنی جائداد کو اپنی زندگی ہی میں اولاد کے حوالے کرنا چاہے تو وہ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ کے اصول کو رہنما بنائے گا اور اگر وہ ترکہ چھوڑ کر مر جائے تو اس کی جائداد کی تقسیم میں بھی اسی قانون پر عمل کیا جائے گا۔ قانونِ الٰہی نے حقوق کی جو شرح ورثا کیلئے مقرر فرمائی ہے اس کی پابندی کرنا اُس کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ شریعت کے مقرر کردہ دوسرے حدود و قیود کی پابندی کرنا۔ اگر کوئی شخص جائداد کی تقسیم میں مذکورہ اصول کے بجائے کوئی دوسرا اصول اختیار کرتا ہے تو وہ گویا اپنا شارع اپنی ذات ہی کو بناتا ہے۔ خدا کے قانون کی موجودگی میں ایک مسلمان کا اسکے بالمقابل اپنی پسند کے مطابق اصول وضع کرنا قرآنی قانون کی سخت خلاف ورزی ہے۔ حدود اللہ کی خلاف ورزی میں اس

سے بڑھ کر جسارت اور کیا ہو سکتی ہے کہ آدمی جس قانون کا شرعاً پابند ہو، اُس کو وہ اپنی پسند کے مطابق تشکیل کرنے لگے۔

اسلامی قانون میں وارث کے حق میں وصیت کی ممانعت کی گئی ہے۔ اس ممانعت کے ذریعہ سے شریعت دراصل ورثا کے حقوق کا تحفظ کرنا چاہتی ہے۔ یوں بھی وصیت کا اختیار ایک تہائی مال کی قید کے ساتھ ہے۔ قابل غور بات ہے کہ ایک طرف تو شریعت میں تیسرا حصہ جائداد ورثا کو دینے کی ممانعت ہو اور دوسری طرف ہبہ کے ذریعہ سے تمام جائداد ورثا میں قانونِ شریعت کے علی الرغم بانٹ دینے کا حق حاصل ہو، یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ شریعت نے خرابی کا ایک راستہ بند کر کے دوسرا اُس سے بڑا راستہ کھول دیا۔ گویا ورثا کی حق تلفی اگر وصیت کے نتیجہ میں ہو تو ناجائز ہے۔ لیکن اگر ہبہ کے نتیجہ میں وقوع پذیر ہو تو جائز ہو گی۔ اس طرح کا تضاد انسانی قوانین میں پایا جاتا تو ممکن ہے لیکن خدا کی شریعت اس عیب سے مبرا ہے۔ شریعت کا مطلوب اگر ورثا کے حقوق کا تحفظ ہے تو اپنی منشا کے مطابق مال کا اولاد کو ہبہ کر دینا کسی طرح جائز نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

مسلمان کا فرض اعلائے کلمۃ الحق اور اللہ کے دین کو تمام ادیانِ باطل پر غالب کرنا ہے لیکن جب ہبہ علی الاولاد کے مسئلہ کو ہمارے معاشرہ میں جواز کی راہ ملتی ہے تو قانونِ خداوندی سے بچنے کی خاطر یہ حیلہ ایک چور دروازے کا کام دیتا ہے اور انجام کار رواج کا قانون خدا کے قانون پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔ کوئی ایسی صورت جس کے نتیجہ میں مسلمان کا مشن ہی فوت ہو جائے اور وہ اسلامی قانون کے بجائے کسی دوسرے قانون کی اطاعت و وفاداری میں لگ جائے، اسلام برداشت نہیں کر سکتا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شریعت ایکٹ سے بچنے کے لئے حیلہ سازی کا یہ دروازہ کھولنے کی بجائے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ اس ایکٹ ہی کو سرے سے منسوخ کر دیا جائے اور انگریزی عہد حکومت کی طرح لوگوں کو آزادی دے دی جائے کہ وہ جس طرح چاہیں اپنی وراثت تقسیم کریں حیلہ سازی کے ذریعہ لوگوں کو شرک میں ملوث کرنے سے تو کفر ہی بہتر ہے، کیونکہ قرآن مجید غیر اللہ کے قانون کی اطاعت و وفاداری کو شرک قرار دیتا ہے۔

وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهٖ اَحَدًا ۝ وہ (اللہ) اپنے حکم (قانون) میں کسی کو شریک

(کہف) نہیں کرتا۔

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُوْقِنُوْنَ ۝ (مائدہ) کیا وہ جاہلیت کے حکم (قانون) پسند کرتے ہیں، حالانکہ یقین رکھنے والی قوم کے لئے اللہ تعالیٰ سے کونسی ذات بہتر ہے جو حکم (قانون) دے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (مائدہ) جو کوئی اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کے مطابق اپنا فیصلہ نہیں کرتا وہ کافر ہے۔

ہبہ علی الاولاد کی صورت حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوئی تو آپ نے نہ صرف ایسے ہبہ کو ناجائز قرار دیتے ہوئے اسکو واپس لوٹانے کا حکم صادر فرمایا بلکہ ایسی صورت کو ظلم اور بے انصافی قرار دیا، حالانکہ اس معاملہ میں اولاد کے درمیان ترجیحی سلوک سے مقصود صرف بیوی کو راضی کرنا تھا۔

حضرت بشیرؓ بن سعد کی کئی بیویاں تھیں جن سے اولاد تھی لیکن ان کی ایک بیوی عمرہ بنت رواح کا اصرار تھا کہ میرے بیٹے نعمان کو جب تک ایک قطعہ باغ بطور عطیہ نہیں دیا جاتا میں اُس کی پرورش نہیں کروں گی۔ بیوی کی دلجوئی کے واسطے حضرت بشیرؓ نے نعمان کو باغ ہبہ کیا بیوی اس ہبہ کی مضبوطی کے لئے یہ چاہتی تھی کہ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنایا جائے۔ جب معاملہ حضورؐ کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے اسے ظلم پر مبنی قرار دیا اور ہبہ کو واپس لوٹانے کا حکم صادر فرمایا، حضرت نعمانؓ جب کچھ بڑے ہوئے تو والد کو یہ خیال آیا کہ باغ کی بجائے ان کو ایک غلام ہبہ کر دیا جائے اُن کی بیوی کا بھی یہ خیال تھا کہ باغ کی نسبت غلام کی قیمت چونکہ کم تھی اس وجہ سے غلام کے عطیہ پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بننے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا اور بعد میں کسی جھگڑے کا احتمال نہ ہوگا۔ جب معاملہ حضورؐ کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے اسے بھی ناجائز قرار دیتے ہوئے ہبہ واپس لوٹا دیا۔

آپ کے ارشادات مختلف روایتوں میں یوں ملتے ہیں۔

(۱) اعدلوا بین اولادکم۔ اپنی اولاد کے درمیان عدل کرو۔

(۲) انی لا اشھد علی جور۔ میں ظلم پر گواہ نہیں بنتا۔

(۳) سووا بینھم - ان کے درمیان مساوات برتو -
(۴) فلیس اصلح ھٰذا - یہ ٹھیک نہیں -
(۵) انی لا اشھد الا بالحق - میں حق کے سوا کسی چیز پر گواہ نہیں بن سکتا -
(۶) ولبنیك علیك حق ان تعدل بینھم - تیرے بیٹوں کا تجھ پر حق ہے کہ تو ان کے درمیان عدل کرے -

حضور نبی اکرمؐ کے ان ارشادات سے نہ صرف یہ کہ ہبہ علی الاولاد کی قباحتوں کے بیشمار پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے بلکہ اُن دلائل اور وجوہات کی تردید بھی دستیاب ہوتی ہے جو ایسے ہبہ کا جواز ثابت کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہیں اس واقعہ کے علاوہ حضورؐ کے سامنے کوئی دوسرا واقعہ پیش نہیں آیا جہاں آپ نے ہبہ علی الاولاد کی کسی صورت کو پسند فرمایا ہو یا کم از کم اس پر خاموشی اختیار کی ہو -

مزید برآں آیت کلالہ کا شانِ نزول اس بات کی دلیل ہے کہ ایسے موقعہ پر جس کے ساتھ ہبہ کی بڑی مناسبت تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ایک صحابی کو ہبہ کا مشورہ دے سکتے تھے، وہاں بھی اللہ تعالیٰ کا قانون نازل ہوا - چنانچہ حضرت جابرؓ بن عبداللہ انصاری روایت کرتے ہیں کہ میں بیمار ہوا اور حضورؐ میری عیادت کو تشریف لائے - میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے پاس مال ہے اور میں کلالہ ہوں - یعنی نہ میرے والدین ہیں اور نہ کوئی اولاد - بہنیں ہیں - اپنا مال بہنوں کو کیونکر تقسیم کروں - اسوقت آیت نازل ہوئی جس میں قاعدہ للذکر مثل حظ الانثیین (مرد کے لئے دو عورتوں کے برابر کا حصہ ہے) کو دہرایا گیا -

حضرت نعمان بن بشیرؓ کی حدیث کو بعض فقہا نے محض اخلاقی حیثیت دی ہے اور اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مشورہ قرار دیکر اسکی قانونی حیثیت کو مجروح کیا ہے - اپنے اس موقف کے حق میں انہوں نے جو دلائل پیش کئے ہیں اور ان سے جو نتائج اخذ کئے ہیں ان پر لاتعداد فقہا نے تعاقب کیا ہے - اِن سلف صالحین کے جوابات میں دلائل کے اعتبار سے بڑا وزن پایا جاتا ہے کیونکہ وہ ہر دلیل کی بڑی مسکت تردید متن حدیث سے پیش کرتے ہیں - اور جب فقہا کی بات کی تردید حدیث رسول پاکؐ کے الفاظ سے ہو تو فقہا کی پیروی بھی اسی بات میں ہے کہ حدیث کی پیروی کی جائے - ہماری اس بات کی تائید ہوگی اگر آپ زرقانی - اختیارات ابن تیمیہ - مسند امام احمد - دلیل الطالب - مسک الختام -

مغنی ابن قدامہ۔ تحفۃ الاحوذی۔ محلی ابن حزم۔ قسطلانی۔ فتح الباری، طحاوی وغیرہ کتب کا مطالعہ فرمائیں۔ ہم نیل الاوطار میں سے ہبہ سے متعلق مباحث کا ضروری ترجمہ ذیل میں دیتے ہیں:۔

"جو لوگ عطیہ کے سلسلہ میں اولاد کے درمیان تسویہ (مساوات) کو واجب سمجھتے ہیں ان کا استدلال حضورؐ کے قول "اِعْدِلُوْا بَیْنَ اَوْلَادِکُمْ" سے ہے، بخاری نے اس کی تصریح کی ہے اور یہی قول طاؤس، ثوری، احمد، اسحاق اور بعض مالکیہ کا ہے۔ ان لوگوں سے یہ بھی مشہور ہے کہ سرے سے عطیہ ہی باطل ہے۔ احمد کے نزدیک عطیہ تو صحیح ہے مگر اس کو واپس کرانا واجب ہے اور یہ کہ عطیہ میں کمی بیشی بھی جائز ہے اگر اس کا کوئی سبب ہو، مثلاً ایک بچہ قرضہ وغیرہ کی وجہ سے دوسروں سے زیادہ محتاج ہو۔ قاضی ابو یوسف کہتے ہیں کہ ترجیحی سلوک سے مقصود اگر ایک دوسرے کو نقصان پہنچانا ہو تو پھر تسویہ واجب ہے۔ جمہور اس طرف گئے ہیں کہ تسویہ مستحب ہے۔ عطیہ میں کمی بیشی کی جائے تو صحیح مگر مکروہ ہے۔ اور انہوں نے "اِعْدِلُوْا" کے حکم کو استحباب کے معنی میں لیا ہے ..... نعمان کی حدیث سے انہوں نے دس طریقوں سے استدلال کیا۔ جن کا جواب حافظ نے فتح الباری میں دیا ہے۔ ہم مفید اضافوں کے ساتھ اسے بیان کریں گے۔

پہلا سوال یہ اٹھایا گیا کہ نعمان کو جو مال ہبہ کیا گیا تھا وہ اُس کے باپ کا سارا مال تھا۔ حافظ نے اس قول کا متعدد صریح احادیث سے تعاقب کیا جن میں بتایا گیا ہے کہ نعمان کو ایک غلام ہبہ ہوا تھا اور مسلم کی روایت میں ہے کہ "تصدق علی ابی ببعض مالہ" میرے باپ نے اپنا کچھ مال میرے اوپر صدقہ کیا۔

دُوسرا استدلال یوں کیا گیا کہ مذکورہ عطیہ ابھی ادا نہیں کیا گیا تھا بلکہ بشیرؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صرف مشورہ کی غرض سے آئے تھے۔ چنانچہ حضورؐ نے مشورہ دیا کہ ایسا نہ کرو تو وہ رک گئے اس کا یہ جواب ہے۔ کہ نبی اکرمؐ نے عطیہ کی واپسی کا حکم دیا تھا (فَارْجِعْہُ) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عطیہ کی ادائیگی ہو چکی تھی۔ عمرہ بنت رواح کا قول بھی یہی ہے کہ "میں اس وقت تک راضی نہیں، جب تک تم حضور کو اس پر گواہ نہ کرو۔

تیسرا استدلال یوں تھا کہ اگرچہ نعمان بڑے تھے لیکن انہوں نے ہبہ کے مال کو ابھی اپنے قبضہ میں نہیں کیا تھا۔ اسلئے ان کے والد کے لئے رجوع کرنا ابھی جائز تھا۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ یہ بات

اکثر روایتوں کے مضمون کے خلاف ہے خصوصاً لفظ (ارجعہ) یعنی اس عطیہ کو واپس کرو" قبضہ ہو جانے کی دلالت کرتا ہے۔

چوتھی دلیل یہ تھی کہ لفظ اُرجعہ ہبہ کی صحت کی دلیل ہے۔ کیونکہ اگر ہبہ صحیح نہ ہوتا تو اس کا واپس لوٹانا بھی صحیح نہ ہوتا۔ واپس لوٹانے کا حکم اس لئے دیا کہ باپ کو اختیار ہے کہ بیٹے کے ہبہ کو واپس لے لے اگرچہ افضل اس کے برعکس ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ پھر ایسے ہبہ کو ظلم سے تعبیر فرما کر اتَّقُوا اللّٰہَ وَاعْدِلُوْا بَیْنَ اَوْلَادِکُمْ کیوں فرمایا، جبکہ باپ اپنے جائز حق سے فائدہ اُٹھا رہا تھا؛

پانچواں استدلال یہ کیا گیا کہ حضور کا ارشاد ہے اَشْھَدُ عَلٰی ھٰذَا غَیْرِیْ (اس پر غیر کو گواہ کر لو) اس میں دوسروں کو گواہ کرنے کا حکم ہے۔ آپ نے خود امام ہونے کی وجہ سے انکار فرمایا کیونکہ امام کی یہ شان نہیں ہوتی کہ وہ گواہ بنے۔ اس کی شان تو یہ ہے کہ وہ فیصلہ کرے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ امام کی شان میں یہ بات لازم نہیں ہوتی کہ وہ گواہ نہ بنے۔ حق کی گواہی چھپانا ہر ایک کے لئے گناہ ہے خواہ امام ہو یا غیر امام۔ دراصل یہ الفاظ سخت ناراضگی کے موقعہ پر بولے گئے اور حدیث کے باقی الفاظ اس پر دلیل ہیں۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ جمہور کا مسلک یہی ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں کہ حضور کا قول "اشہد" صیغہ امر ہے۔ اور اس سے مراد جواز کی نفی ہے یہ اسی طرح کا قول ہے جیسا حضورؐ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا "اشترطی لہم الولاء" اُن کے لئے وَلَا کی شرط لگا، حضورؐ کا اس معاملہ کو ظلم سے تعبیر کرنا بھی اسی کا ثبوت مہیا کرتا ہے۔

چھٹا استدلال یہ تھا کہ حضورؐ کے قول الا سَوَّیْتَ بَیْنَھُمْ (کیا تو نے ان کے درمیان یکساں سلوک نہیں کیا؟) سے مراد امر مستحب اور نہی تنزیہی ہے حافظ نے اس کا جواب یہ دیا کہ یہ استدلال تسلیم ہو سکتا تھا۔ اگر ان کے علاوہ حضورؐ کے مزید کوئی الفاظ منقول نہ ہوتے۔ بالخصوص سَوُّوْا بَیْنَھُمْ (ان سے یکساں سلوک کرو) کے الفاظ .....

آٹھویں دلیل یہ تھی کہ عطیہ میں اولاد کے مابین مساوات کو ان کے درمیان نیکی کا یکساں سلوک کرنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس میں اس بات کا قرینہ موجود ہے کہ یہ امر مستحب تھا۔ اس کا جواب حافظ نے یہ دیا کہ عدم مساوات پر جور (ظلم) کا لفظ بولنا اور ترجیح یا فضیلت کے طرز عمل سے منع کرنا استحباب پر نہیں بلکہ وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ پس ان دونوں قرائن کو اپنے اصل سے پھیرنا جائز

نہیں۔ (اس کا مطلب یہ ہے کہ اوامر میں اصل وجوب ہے اور نہی میں اصل حرمت۔ یہ دونوں اپنے مقام پر رہیں گے جب تک کوئی قرینہ ان کو اپنے اصل مقام سے ہٹا کر امر سے استحباب اور نہی سے نہی تنزیہی مراد نہ لے، یہاں ایسا کوئی قرینہ موجود نہیں)

نواں استدلال یہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کا حضرت عائشہ کو عطیہ دینا ثابت ہے۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں بھی آیا ہے کہ انہوں نے دوسرے لڑکوں کو چھوڑ کر اپنے بیٹے عاصم کو عطیہ دیا۔ اگر ایسا کرنا جائز نہ ہوتا تو دو خلفاء راشدین یہ غلطی کیوں کرتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عروہ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کو عطیہ دینے پر ان کے بھائی راضی تھے۔ عاصم کے واقعہ میں بھی یہی صورت تھی۔ مزید برآں اصولی طور پر مرفوع حدیث کی موجودگی میں خلفاء کا طرز عمل حجت نہیں ہے۔

دسویں دلیل یہ دی گئی کہ اس پر اجماع ہو چکا ہے۔ کہ ایسا عطیہ جو آدمی اپنی اولاد کے سوا کسی کو دے وہ جائز ہے اس لئے اگر یہ بات جائز ہے کہ وہ اپنی تمام اولاد کو چھوڑ کر کسی غیر کو اپنے مال کا مالک بنا دے تو یہ بھی جائز ہونا چاہیئے کہ وہ بعض اولاد کو چھوڑ دے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نص کی موجودگی میں قیاس کا ضعف مخفی نہیں۔ پس حق بات یہی ہے کہ اولاد کے درمیان تسویہ واجب ہے اور کمی و بیشی کا ترجیحی سلوک حرام ہے۔"

لہٰذا جن بزرگوں نے حدیث مندرجہ بالا کو مشورہ کا مقام دیا ہے وہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ شارع علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے مشورے دینے کے لئے مبعوث نہیں فرمایا تھا حضرت محمد رسول اللہؐ کی بعثت تو قرآن کی اس آیت کے مطابق تھی۔ هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ (اللہ پاک وہ ذات ہے کہ جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اس کو کل دینوں پر غالب کرے) حضورؐ کی اس ذمہ داری کا تقاضا مشوروں سے پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ یوں بھی حدیث شریف میں مشورہ کا وقوع دو دفعہ ملتا ہے۔ ایک بریرہ لونڈی کے نکاح کے موقعہ پر حضورؐ نے اُس کو مشورہ دیا تھا جس پر بریرہ نے آنحضرتؐ سے اس بات کی وضاحت کروالی اور پیروی سے آزاد ہو گئی۔ حضورؐ کا مشورہ اُس نے قبول نہ کیا۔ دوسرے کھجور کے درخت کو پیوند لگاتے وقت لوگوں نے حضورؐ کی بات کو حکم سمجھ لیا حالانکہ وہ ایک مشورہ تھا۔ اور اُس کو قبول کرنے کا انجام خسارے کی صورت میں رُونما ہوا۔ اس پر حضورؐ نے بھی تاسف کا اظہار فرمایا۔ ہر دو

واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ مشورہ کو قبول کرنے میں آدمی آزاد ہوتا ہے۔ اس میں اتباع کرنا واجب نہیں اس اعتبار سے حضرت نعمان بن بشیر کی حدیث کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بشیر کا ہبہ بار بار واپس لوٹایا گیا۔ اور صحابی رسول اللہؐ نے اس حکم کی ایک امر کے طور پر اتباع کی پھر حدیث کے مختلف الفاظ اور جملے اس کی قانونی حیثیت کو واضح کرتے ہیں۔ مثلاً عدل کا لفظ قانونی لفظ ہے۔ شہادت اور ہبہ کا مسئلہ قانونی مسئلہ ہے اور ناجائز یا ناحق کے الفاظ قانون سے تعلق رکھتے ہیں اگر ان سوالات کو وزن نہ دیا جائے تو کسی حدیث کی قانونی یا اخلاقی حیثیت متعین کرنے کے لئے آخر اور کونسی کسوٹی ہے؟

اگر یہ حدیث قانونی حیثیت نہیں رکھتی تو پورے ذخیرہ حدیث اور کچھ حصہ قرآن کی بھی قانونی حیثیت مشتبہ ہو کر رہ جاتی ہے۔

جو لوگ اس حدیث کو مشورہ کا مقام دیتے ہیں، وہ نتیجہ یہ اخذ کرتے ہیں کہ زندگی میں اولاد کو جائداد ہبہ کرنا عنداللہ گناہ ہے مگر جائز ہے۔ یہ تاویل دراصل گناہ کو جائز کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ حالانکہ قرآن مجید نہ صرف گناہ کو بلکہ ایک دوسرے کے حقوق پر دست درازی کو بھی حرام قرار دیتا ہے۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ (اعراف)

اے محمدؐ ان سے کہو کہ میرے رب نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ تو یہ ہیں۔ بے شرمی کے کام خواہ کھلے ہوں یا چھپے اور گناہ۔ اور حق کے خلاف زیادتی۔

لیکن بعض فقہا کا مؤقف نہ صرف گناہ کو جائز قرار دیتا ہے بلکہ اللہ کے مقرر کردہ حقوق پر ہبہ علی الاولاد کے ذریعہ دست درازی کو بھی جائز قرار دیتا ہے۔ اس مؤقف کے قائل حضرات اسکی جس قدر وکالت کریں اس کی حیثیت لارڈ میکالے کی تعزیرات پاکستان سے مختلف نہیں ہو سکتی جس کی رو سے ایک شادی شدہ عورت اغوا ہو جائے یا بداخلاقی کا ارتکاب کرے اور اغوا کنندہ پر عدالت میں مقدمہ چلے تو استغاثہ اگر یہ ثابت کر دے کہ ارتکاب کنندہ کو معلوم تھا کہ عورت شادی شدہ ہے اور معلوم ہونے کے باوجود اُس نے سب کچھ کیا تو وہ قانون کی زد میں آجائے گا۔ لیکن اگر استغاثہ یہ ثابت نہ کر سکے اور ملزم یہ ثابت کر دے کہ اُسے عورت کے منکوحہ ہونے کا کوئی

علم نہ تھا تو قانون اُسے بَری کر دے گا۔ گویا سمجھا جائے گا کہ یہ گناہ تو ہے مگر قانوناً مَرد و زن کا یہ فعل جائز ہے۔

لہٰذا اسلامی قانون میں اگر اسی قسم کے رخنے پیدا کر لئے جائیں اور چور دروازوں یا حیلہ سازیوں کی راہ کھول دی جاوے تو یہ اسلامی قانون کی کوئی خدمت نہ ہوگی۔ بلکہ یہ صورت اُلٹا اس کی بدنامی اور زوال کا سبب بنے گی۔ یہ اسی طرح کی کیفیت ہے جس میں کہا جاتا ہے کہ سال گزرنے کو تھا کہ مال بیوی کے نام کر دیا گیا اور دوسرا سال ابھی پورا ہونے نہیں پایا تھا کہ مال میاں نے لے لیا تاکہ نہ سال پُورا ہو اور نہ زکوٰۃ دینا پڑے۔ غالباً ایسا کرنا بھی عند اللہ گناہ ہے مگر قانوناً جائز ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا قانون موم کی ناک ہے کہ جس طرف چاہا موڑ لیا؟ کیا قانون لوگوں کے سامنے بے بس ہے یا لوگ قانون کے سامنے بے بس ہونے چاہئیں؟ کیا قانون ان حیلہ سازیوں کا علاج نہیں کر سکتا؟ اگر قانون کے ہاتھ بند ہوتے تو حضرت ابُوبکر صدیقؓ مانعین زکوٰۃ پر کیسے چڑھائی کر سکتے تھے؟ اور وہ کیا دلیل تھی جس نے حضرت عمرؓ اور دوسرے جلیل القدر صحابہ کو اس معاملہ میں خاموش کر دیا تھا۔ لہٰذا موشگافیوں کے چکر میں پڑنا درست نہیں۔ ہم نے یہ مثالیں اس لئے پیش کی ہیں کہ اندازہ ہو سکے کہ حضرت نعمان بن بشیرؓ کی حدیث کو جن بزرگوں نے مشورہ کا مقام دیا ہے یہ اُن کا سہو ہے۔ اور یہ چیز قابلِ تقلید نہیں بلکہ قابلِ اصلاح ہے۔ اور اس کے برعکس جن حضرات نے اس حدیث کو قانون کا مقام دیکر ایسے ہبہ کو باطل قرار دیا ہے اور عدالت کو ایسے ہبہ کے توڑنے کا حق دیا ہے وہ بالکل درست ہے اور منشاءِ شریعت کے عین مطابق ہے۔

حضورؐ کو اپنے ایک صحابی کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا اس کا تعلق صرف بیوی کو خوش کرنے کی حد تک تھا۔ لیکن آج کل جو صورت حال رونما ہو رہی ہے اس کے نتیجہ میں معاشرہ اسلامی قانون کی وفاداری کے بجائے ہندو رواج کو پسند کر رہا ہے اور لوگ نہیں چاہتے کہ لڑکیاں اُن کی جائداد کی وارث ہوں۔ ایسی صورت کو بھلا اسلام کیسے برداشت کر سکتا ہے؟ حضورؐ کے سامنے اگر ایسے حالات کا ظہور ہوتا تو آپ اس مشرکانہ معاملہ کا بڑا سخت نوٹس لیتے۔ جن فقہا نے ہبہ علی الاولاد کو جائز کہا ہے۔ اگر اُن کے سامنے بھی موجودہ صورت حال رونما ہوتی تو وہ بھی لازماً اسے حرام قرار دیتے۔ ہمارے فقہائے عظام تو بار بار اپنی کتابوں میں لکھ چکے ہیں کہ حدیث

رسول اللہؐ کے مقابلہ میں ہماری بات کو دیوار پر دے مارو۔ لہٰذا اس معاملہ میں اُن پر تو کوئی گرفت نہیں ہوگی۔ البتہ ہم لوگ عنداللہ مجرم قرار پائیں گے جو عبرت نہیں پکڑتے۔

اُوپر کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اولاد میں سے بعض کے حق میں باستثنائے دیگر ہبہ کرنا سراسر قرآن وحدیث کے خلاف ہے۔ یہ نہ صرف گناہ ہے بلکہ قطعی طور پر حرام ہے۔ ہمارے مروجہ قانون کی نظر ثانی ہونی چاہیئے۔ علماءِ اسلام کو اس کے خلاف آوازِ حق بلند کرنی چاہیئے تاکہ ہماری عدالتیں اس پہلو پر غور و خوض کر کے "قانون ہبہ دربارہ بعض اولاد باستثنائے دیگراں" کی صحت کر سکیں۔

بقیہ مضمون صفحہ نمبر ۵۶

رُوح القرآن

فاضل مصنف کے عنوانات "امن خمسہ" اور "قل خمسہ" اگرچہ دلچسپ ہیں لیکن عام قارئین کی سمجھ سے شاید بالاتر ہوں گے۔ کتاب کے شروع میں مشکل اور اصطلاحی الفاظ کا ایک فرہنگ بھی دیا گیا ہے جس میں الفاظ کے معانی کے تمام اطراف دے دیئے گئے ہیں حالانکہ کتاب میں جہاں کہیں وہ الفاظ بیان ہوئے ہیں ان سے مراد ان کا کوئی خاص پہلو ہے۔

کتاب اچھے کاغذ پر بلاک کے ذریعہ سے چھپی ہے اور مجلد ہے۔ آیات کا عربی متن اس میں نہیں دیا گیا ہے۔ البتہ ناشرین کی طرف سے یہ اعلان اس میں موجود ہے کہ کتاب کے آئندہ ایڈیشن میں عربی متن کا اضافہ کر دیا جائیگا۔

(خ-م)

اقتباسات و تراجم

جناب محمود احمد صاحب

آزادی اور غلامی

آزادی نہ تو، عامیانہ تصور کے مطابق، کسی گروہ کے ترقی و سیادت کے حصول کا نام ہے کیونکہ یہ تو محض سیاسی آزادی ہوئی جبکہ قوم کی فکری، ثقافتی اور نظریاتی آزادی کی منزل اس سے کہیں آگے ہے۔ اور نہ ہی آزادی، جو انوں کی اکثریت کی رائے کے مطابق، انسان کے اپنی خواہشات کے پیچھے بگٹٹ بھاگنے کا نام ہے کہ وہ جو چاہے کھائے اور جو چاہے کرے اور جس چیز کی خواہش کرے اس کے حصول کے لئے بلا تکلف تگ و دو کر سکے کیونکہ ایسی آزادی کی ابتداء بدنظمی اور انتشار ہے اور اس کی انتہا ایک گھٹیا قسم کی غلامی ہے۔

جہاں تک آزادی کے بدنظمی اور انتشار ہونیکے پہلو کا تعلق ہے، یہ حقیقت کسی سے مخفی نہیں کہ دنیا میں مطلق آزادی کا، جو کسی نظام اور قانون کی پابند نہ ہو، تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہاں ہر شے ایک قانون اور ضابطے میں بندھی ہوئی ہے۔ چنانچہ فرد کی آزادی کی ضمانت اس وقت تک نہیں دی جا سکتی جب تک اسے بعض پابندیوں میں نہ جکڑ دیا جائے تاکہ اس جیسے دوسرے افراد کی آزادی بھی محفوظ و مامون کی جا سکے۔ قوانین، دساتیر، شریعتوں اور نظاموں کی عائد کردہ پابندیوں کی حکمت بھی اسی میں مضمر ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے بڑے شہروں کے ٹریفک کے قوانین کو لیجئے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص نشاناتِ راہ کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی گاڑی اندھا دھند چلا سکے؟ راحتِ عامہ کے قانون کی مثال لیجئے، کیا کسی کو اس بات کی اجازت دی جا سکتی ہے کہ وہ آباد سڑکوں پر آدھی رات کے بعد راگ الاپتا دندناتا پھرے؟

سیفٹی قوانین پر غور کیجئے، کیا ملک کے کسی باشندے کو ایسی آراء کی نشر و اشاعت کی اجازت دی جاسکتی ہے جو ریاست کے امن و امان کو غارت کرنے والی اور اس کی سلامتی کے لئے خطرہ بننے والی ہوں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص دشمن سے صلح کی دعوت دینے کی جرأت کر سکے درآں حالیکہ اس کی قوم اور اس دشمن کے درمیان گھمسان کا رن بپا ہو؟ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص دشمن کے ساتھ تجارت کرے اور اپنے ملک کے مال مویشی اس کی طرف ہنکا دے اور اسے عبرتناک سزا نہ دی جائے حتیٰ کہ سزائے موت سے بھی دریغ نہ کیا جائے؟ آزادی کی تکمیل تمام پابندیاں دور کر دینے اور آزادی کو انتہا تک پہنچانے سے نہیں ہوتی بلکہ بسا اوقات پابندیاں ہی اس مقصد کے حصول کا ذریعہ بنتی ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے مریض کو کھانے پینے کی مکمل آزادی لوٹانے سے پہلے یہ ضروری ہوتا ہے کہ، وقتی طور پر، ان اغذیہ کے استعمال پر پابندی لگا دی جائے جن سے ضرر کا اندیشہ ہو یا پھر جس طرح مجرم سے وقتی طور پر اس کی آزادی چھین لینے سے مقصود اسے آزادی کے صحیح استعمال کی تربیت دینا ہوتا ہے تاکہ آئندہ نہ وہ اپنے لئے کوئی فتنہ کھڑا کرے اور نہ معاشرے ہی کو ایذاء دے۔

مزید برآں انسان کے لئے یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ دوسروں سے الگ تھلگ ہو کر رہ سکے۔ اسے لازماً ایک مربوط معاشرے کے جزو کی حیثیت سے رہنا پڑتا ہے جس کا ہر حصہ دوسروں کو ایذاء پہنچا سکتا ہے۔ اس حقیقت کو ایک عمدہ تمثیل سے سمجھا جا سکتا ہے جو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی۔

آپ نے فرمایا کہ کچھ لوگ ایک کشتی میں سوار تھے، ایک گروہ بالائی اور دوسرا زیریں حصے میں تھا۔ نیچے والے اُوپر والوں سے اپنے لئے پانی حاصل کیا کرتے۔ اسی دوران میں انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ وہ کشتی کا پیندا چھید ڈالیں اور براہِ راست سمندر سے پانی حاصل کر لیا کریں تاکہ اُوپر والوں کا زیرِ بار احسان نہ ہونا پڑے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ اگر اس موقع پر اوپر والوں نے نیچے والوں کو من مانی کرنے کی آزادی دے دی تو سب ہلاک ہو جائیں گے اور اگر انہوں نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا تو سب بچ رہیں گے۔ انسانیت کے معلم اکبر نے اس دلنشین تمثیل سے وہ حد فاصل متعین کر دی ہے جو اس شخصی آزادی کو جو اپنے اندر دوسروں کے لئے ضرر کا

کوئی پہلو نہ رکھتی ہو، اس آزادی سے الگ کر دیتی ہے جس کے من مانے استعمال سے معاشرے کو ایذاء پہنچے اور اسے ہلاکت کا سامنا کرنا پڑے۔

جہاں تک ایسی شتر بے مہار آزادی کے فی الحقیقت غلامی ہونے کا تعلق ہے تو کامل آزادی کا پیمانہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ دُنیاوی اعتبار سے کسی کا ہم پلّہ یا اس سے فروما یہ شخص اسے اپنی غلامی کے بندھنوں میں نہ جکڑ سکے۔ اور انارکی اور انتشار کی وہ حالت، جسے بعض لوگ شخصی آزادی سے تعبیر کرتے ہیں، اپنے جیسے یا اپنے سے فروتر انسانوں کی غلامی کی ایک مکروہ شکل ہے۔

جب آدمی پر ہر لذّت کے پیچھے بھاگنے کی عادت غلبہ حاصل کر لیتی ہے اور وہ اس بھاگ دوڑ میں ہر پابندی سے آزاد ہو جاتا ہے، اس وقت لذّت اپنی غلامی کا دامن پھیلا کر اسے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیتی ہے اور وہ اس کا اسیر بن کر ہر قدم اسی کے ارادے اور تحریک کے تحت اٹھاتا ہے اور وہ جو چاہتی ہے اس سے کرواتی ہے حتّٰی کہ وہ اس کے بندھنوں میں اس بُری طرح جکڑا جاتا ہے کہ پھر اپنے آپ کو چھڑانے کی استطاعت کھو دیتا ہے۔ آخر یہ آزادی کی کون سی قسم ہوئی جو زندگی کی کم قیمت اور بے معنٰی اقدار کی کھلے بندوں بندگی کا روپ دھار لیتی ہے؟ اگر انسان کی قدر و قیمت اس کے لذائذ سے بہرہ اندوز ہونے کی مقدار کی نسبت سے ہوتی تو حیوانات یقیناً اس سے زیادہ قابلِ قدر محسوب ہوتے کیونکہ وہ اپنی لذات کی طلب و سعی میں کسی قید یا مقصد کے پابند نہیں ہوتے۔ درآنحالیکہ انسان کو اپنی مرغوب لذائذ کے حصول کی راہ میں، اپنی خواہش کے باوجود، چند در چند رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو اس کے اور اس کی مرغوبات کے درمیان حائل ہوتی ہیں۔ کیا اس صورت میں کوئی شخص یہ دعوٰی کر سکتا ہے کہ وہ حیوان جس پر حصولِ لذات کی راہ میں کوئی پابندی حائل نہیں ایک انسان سے زیادہ آزاد اور اس کے نتیجہ میں اس سے زیادہ خوش بخت ہے؟

اور کیا وہ شخص جو کسی عورت پر فریفتہ ہو یا ان حسیناؤں کے پیچھے سرگرداں رہتا ہو جن سے وہ اپنی مرغوباتِ نفس پوری ہونے کی توقع رکھتا ہو یہ دعوٰی کر سکتا ہے کہ وہ ان کے اقتدار سے آزاد ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ وہ اپنے محبوب کے ہجر یا ہجر کے بعد وصال کے سبب سے اس کے ہر غمزہ و ادا کا اسیر، ہر اشارے کنائے کا مرہونِ خود اپنی عقل سے بدگمان اور عزیز زندگی تک سے

بیزار ہو جاتا ہے؟ اس سے زیادہ ذلیل غلامی بھلا کیا ہوگی کہ آدمی محبت و نفرت، تعلق و انقطاع، رضا و غضب اور آرام و اضطراب کے معاملات میں کسی کی مرضی کا پابند ہو؟

اور جب انسان مسکرات سے رغبت پیدا کر لیتا ہے تو ہر جام اس کے لئے بے شمار خرابیوں کی راہیں کھول دیتا ہے۔ اور بالآخر اس کے اعصاب مفلوج، اس کی صحت برباد اور اس کی عقل و شرافت سلب ہو جاتی ہے۔ کیا وہ اس حالت میں یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ آزاد ہے؟ کیا اس جہان میں شرابِ ناب کی سی قاتل اور مہلک شے کی غلامی سے بدتر غلامی کا بھی تصور کیا جا سکتا ہے؟

یہی حال مال و جاہ پر جان دینے اور وطن اور قوم کے لئے تعصب رکھنے والوں کا ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر جذبہ جب آدمی پر چھا جاتا ہے تو اسے اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیتا ہے۔ خواہشات نفس کو مغلوب کر لیتی ہیں یہاں تک کہ اعمال اور اخلاق ان کے زیرِ حکم آ جاتے ہیں اور وہ ایسی بدترین غلامی کے گڑھے میں انسان کو جا گراتی ہیں جس کی قباحت کا اندازہ بھی مشکل ہے۔ قرآن مجید نے نہایت عمدہ اسلوب میں اس حالت کی تعبیر کی ہے فرمایا

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ بھلا دیکھو تو اس شخص کو جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا لیا۔ (الجاثیۃ ۲۳)

خواہشِ نفس اس طرح کے لوگوں کے لئے وہی درجہ رکھتی ہے جو کہ مؤمنین کے لئے الٰہ حقیقی کا ہے آخر الٰہ اسی کو تو کہا جاتا ہے جس کو پوجا جاتا ہو اور جس کی اطاعت کی جاتی ہو، جس سے ڈرا جائے اور جس سے اُمید رکھی جائے کیا یہ سچ نہیں کہ خواہشِ نفس کے بندے اپنی خواہشات کے سامنے سرفگندگی اختیار کر لیتے ہیں، پسند اور ناپسند میں ان کا معیار قبول کر لیتے ہیں اور ان کے لئے ان شہوات کی ناراضگی مول لینا یا ان کی پسندیدہ راہ سے ہٹنا ناممکن ہو جاتا ہے؟

غلامی محض قید و بند کو نہیں کہتے کیونکہ یہ تو غلامی کی سہل ترین قسموں میں سے ہے جو بہت جلدی جاتی رہتی ہے، غلامی تو درحقیقت اس عادت کی ہوتی ہے جو جڑ پکڑ لے یا پھر اس شہوت کی ہوتی ہے جو سر پر سوار ہو جائے اور اس لذت کی ہوتی ہے جس کی اطاعت سے کنارہ کشی ممکن

نہ ہو۔ اسی طرح آزادی محض نقلِ مکان پر قدرت رکھنے کو نہیں کہتے کیونکہ یہ آزادی کی سب سے ادنیٰ اور کم قیمت قسم ہے، حقیقی آزادی تو یہ ہے کہ آدمی اپنی خواہشات اور وساوسِ نفسی پر قابو رکھتا ہو، کوئی عادت اسے اپنا اسیر نہ بنا سکے اور کوئی شہوت اسے سپر ڈالنے پر مجبور نہ کر سکے۔

دیندار اور حقیقی مومن اسی معنی میں آزاد تھے اور ان کی آزادی غیر محدود تھی۔ دینِ حق نے انہیں طمع، خواہشات اور شہوات کے غلبے سے چھڑا لیا تھا، ان کے نفوس کو خالقِ کون و مکان سے جوڑ دیا تھا اور ان کے ارادے کو اسی کے ارادے کا پابند بنا دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی حق ہے اور وہی تمام خیر اور محبت و رحمت کا سرچشمہ ہے۔ پس جسے حق اور خیر اور رحمت اپنی غلامی سے سرفراز کریں بھلا وہ ان سے متضاد مذموم صفات کا غلام رہ سکتا ہے؟

جب کیفیت یہ ہے کہ انسان کو کسی نہ کسی فکر یا وسوسے یا عادت کی بندگی سے مفر نہیں تو وہ لوگ جنہیں حق تعالیٰ اپنی بندگی میں لے لے ان لوگوں سے یقیناً افضل ہیں جنہیں باطل کی غلامی سے دوچار ہونا پڑے۔ اور وہ لوگ جن پر ایسے اعلیٰ انسانی محرکات کا غلبہ ہو کہ جن کا منبع خود ذاتِ باری ہے ان لوگوں سے یقیناً افضل ہیں جنہیں کوئی شہوانی محرک جس کا ناتا شیطان سے جا ملتا ہو، اپنا مطیعِ فرمان بنا لے۔ اور وہ لوگ جو خدائے تعالیٰ کے سامنے سرفگندہ ہوں اور اس کے امر و نہی کی پابندی کرتے ہوں ان لوگوں سے افضل، اکمل اور دُور اندیش ہیں جو مال، لذتِ زنِ بازاری یا جامِ ارغوانی کے سامنے سپر ڈال دیں۔ اس کی روشنی میں ان نام نہاد ترقی پسندوں کی حماقت ملاحظہ کیجئے جو لوگوں کو اس سے روکتے ہیں وُہ انہیں عبداللہ یا عبدالجواد کی قسم کے ان ناموں سے پکاریں جو ان کے ماں باپ نے رکھے تھے۔ یہ لوگ بزعمِ خویش اپنے آپ کو عبودیت سے متصف کرنے کو ناپسند کرتے ہیں۔ کیا انہی لوگوں کو تم نہیں دیکھتے کہ اس ہستی کی غلامی سے تو کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں جس کے اقتدار سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں لیکن اس کے بدلے کسی حقیر سی شہوت یا معمولی سی رغبت کی بندگی کا قلادہ بخوشی گلے میں ڈال لیتے ہیں؟

وسیع تر معنوں میں آزادی انہی کو حاصل ہوتی ہے جو اللہ کی بندگی میں شدید تر ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں کوئی حسینہ فریفتہ نہیں کر سکتی، کوئی شہوت قابو میں نہیں لا سکتی، کسی قسم

کا مال انہیں اپنی چاکری پر مجبور نہیں کر سکتا، کوئی لذت ان کی ذکاوت اور ہوش و خرد کو ضائع نہیں کر سکتی، کوئی طمع یا بے قراری ان کے وقار اور عزتِ نفس کو گزند نہیں پہنچا سکتی اور کوئی خوف یا مصیبت انہیں نیچا نہیں دکھا سکتی۔ خدائے واحد کی بندگی انہیں ماسوا اللہ کے خوف سے نجات دلا دیتی ہے۔

اَلَا اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ - اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا یَتَّقُوْنَ - لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ - لَا تَبْدِیْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ - ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ[1] (یونس ۶۲-۶۴)

اللہ نے سچ فرمایا۔ یہی لوگ ہیں جو اللہ کی بندگی کی برکت سے غیر اللہ کے سامنے جھکنے سے بچ رہتے ہیں اور یہی لوگ عزتِ نفس کے مالک، حقیقی معنوں میں آزاد، دل کے غنی اور اخلاق میں بلند ہوتے ہیں۔ میری جان کی قسم یہ عظیم آزادی ہے۔ رسول اللہ ؐ نے سچ فرمایا تھا کہ "توانگری کثرتِ مال سے نہیں بلکہ دل کی توانگری سے ہے" (بخاری، مسلم) اور ابنِ عطار کا کیا ہی اچھا قول ہے کہ "جس سے تجھے کوئی امید نہیں، اس سے تو آزاد ہے اور جس کی تو طمع رکھتا ہے اسی کا بندہ ہے۔"

اوپر حریت اور عبودیت کی جو حقیقت ہم نے بیان کی ہے اس کی روشنی میں عظیم صوفی شیخ احمد بن خضرویہ کے اس قول کی بلیغ حکمت اچھی طرح سمجھ میں آ سکتی ہے کہ "آزادی میں نری غلامی ہے اور سچی بندگی میں مکمل آزادی"۔

(البعث الاسلامی)

---

[1] "سن رکھو کہ جو خدا کے دوست ہیں ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔ یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے اور پرہیزگار رہے۔ ان کے لئے دنیا میں بھی بشارت ہے اور آخرت میں بھی۔ خدا کے وعدے اٹل ہیں۔ یہی تو بڑی کامیابی ہے"

تقریظ وتنقید

رُوح القرآن

تالیف : آچاریہ ونوبا بھاوے

صفحات : ۳۸۴

قیمت : ۴ روپے

ناشر : اکھل بھارت سروسیوا سنگھ پرکاشن : راج گھاٹ کاشی (انڈیا)

ھندوستان کی بھودان تحریک کے لیڈر آچاریہ ونوبا بھاوے کسی تعارف کے محتاج نہیں ۔ آپ گاندھی جی کے رفقاء میں سے ہیں اور ان کے پیغام اور طریق کار کے علمبردار ہیں۔ بھاوے جی کے نزدیک انسان اور انسان کے درمیان ہمدردی، تعاون اور اخوت کا سلوک ہونا چاہیئے نہ کہ بغض وعداوت کا۔ اس لئے انہوں نے مختلف مذاہب کے پیروؤں کو قریب تر لانے کی جدوجہد شروع کر رکھی ہے۔ زیر نظر کتاب کی تمہید میں فرماتے ہیں ،

"سائنس نے دنیا چھوٹی بنائی اور سب انسانوں کو نزدیک لانا چاہتا ہے۔ ایسی حالت میں انسانی سماج فرقوں میں بٹا رہے ، ہر جماعت اپنے کو اونچا اور دوسروں کو نیچا سمجھے، یہ کیسے چلے گا؟"

ہمارے نزدیک بھاوے جی کی یہ کوشش قابل تحسین ہے۔ آخر کتنے تعجب کی بات ہے کہ وہ انسان جو مادی حقائق کو جاننے کے لئے اپنی جان جوکھم میں ڈالتا ہے اور ایسی ایسی شعبدہ بازیاں کرتا ہے کہ آدمی انگشت بدنداں رہ جائے ، اپنے عقیدہ وعمل اور اخلاق وکردار کے معاملے میں حقیقت شناسی کے جوہر بالکل نہیں دکھاتا۔ زندگی کے اس گوشے میں اس کا استدلال غیر منطقیانہ اور اس کے مزعومات خلاف عقل ہوں تو اس کے لئے کسی پریشانی کا باعث نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ وقت اور فاصلے کی سابقہ تعبیروں میں عظیم تبدیلی آجانے کے باوجود انسانی سماج

آج تک تفریق و انتشار کی دلدل سے نہیں نکل سکا۔ ہمارے نزدیک ہر وہ کوشش قابل قدر ہے جو انسان کو حقیقت شناسی کی طرف بلائے۔

اہل مذاہب کے دلوں کو جوڑنے کے اس مقصد کے تحت بھاوے جی نے پہلے دھم پد اور گیتا پر وچن نامی دو کتابیں لکھیں جن میں ہندومت کی بنیادوں کو اجاگر کیا۔ اب اسی مقصد کے تحت آپ نے زیر نظر کتاب تالیف کی ہے جس میں قرآن مجید کی ۱۰۶۵ آیات کو ۴۰۰ عنوانات کے تحت اور ان عنوانوں کو نو قطعات میں قلمبند کیا ہے۔ ان قطعات کے نام اور ترتیب یہ ہے ادخال بہ کتاب — اللہ — عبادت — عابد و ملحد — اعتقادِ دین — اخلاق — انسان اور اس کی فطرت — رسول — سربستہ رازوں کی طرف اشارہ — ان قطعات میں بھاوے جی نے وہ تمام آیتیں جمع کی ہیں جن کے متعلق وہ اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ وہ روح قرآن کو پیش کرنے والی ہیں۔

رہا یہ سوال کہ روح قرآن کو اخذ کرنے کی یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوئی ہے، تو ہمارا خیال یہ ہے کہ مصنف نے ہماری توقع سے زیادہ قرآن کے فلسفہ اور دین کی بنیادوں کو پیش کیا ہے۔ قطعات کے مذکورہ ناموں ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی تینوں بنیادوں، توحید، رسالت اور آخرت کو کتاب میں مناسب نمائندگی دی گئی ہے تاہم انتخاب حرف آخر کی حیثیت نہیں اور بعض جگہ تو مصنف نے قرآن کی آیات سے اپنے نظریات کی تائید کا فائدہ حاصل کرنے کی کوشش بھی کی ہے اور اس کے برعکس قرآن کے بعض اہم مباحث کو نظر انداز کر دیا ہے۔

مثال کے طور پر فاضل مصنف نے سَبْتاً وَّحُصُوْراً کے الفاظ سے حضرت یحییٰ علیہ السّلام کے "برہمچاری" ہونے کا نتیجہ تو نہ صرف اخذ کیا بلکہ اسے روحِ قرآن میں شمار کیا لیکن دوسری طرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت کو نمایاں کرنے والی اہم ترین آیت

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝

وہی ذات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ وہ اس دین کو دوسرے تمام ادیان پر غالب کرے، اگرچہ مشرکین ناپسند کریں۔

کو ان کی کتاب میں کوئی جگہ نہ مل سکی۔

اسی طرح "مذہبی رواداری" کے عنوان کے تحت انہوں نے وہ آیتیں بیان کی ہیں جن کا ذکر صرف بعید ترین مناسبتوں سے ہی کیا جا سکتا تھا اور جہاں تک مسلمان عارفین کا تعلق ہے وہ ایسی آیات کو قطع علائق اور اظہار بیزاری کی آیتیں سمجھتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف انہوں نے ان تمام مضامین سے صرف نظر کیا ہے جن میں مسلمانوں کو ان لوگوں سے حرب و قتال وغیرہ کی تلقین کی گئی ہے جو خدا کی زمین میں فساد پھیلانے والے اور اہل ایمان پر عرصہ حیات تنگ کرنے والے ہوں۔

اس رد و قبول کی وجہ آخر اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ بھاوے جی کے ذہن میں جو فلسفہ موجود ہے اس سے موافقت رکھنے والی آیات تو انہوں نے پیش کر دیں لیکن جو آیات اس کی مخالف تھیں ان کو انہوں نے درخورِ اعتناء نہیں سمجھا۔

مصنف نے عابدین کی خصوصیات بتانے کے لئے جو آیات جمع کی ہیں ان سے انہیں معاف کرنے والے، سخی، باہمی مشورے سے کام کرنیوالے اور تعلقات کو جوڑنے والے ثابت کیا ہے اور اس باب کا عنوان لگایا ہے "اہنسا پسند"۔ اگر اہنسا انہی صفات کی تعبیر ہے تو ہمیں اس عنوان پر کوئی اعتراض نہیں لیکن اگر مصنف کے نزدیک اہنسا سے مراد وہ فلسفہ ہے جو گاندھی جی نے پیش کیا اور اس کے وارث فاضل مصنف خود ہیں تو ہم ادب سے گذارش کریں گے کہ بیان کردہ آیات کا اس عنوان سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

"روح القرآن" کی تیاری میں مصنف نے بڑا اہتمام کیا ہے اور اس بات کی کوشش کی ہے کہ اس میں کوئی غلطی نہ رہ جائے لیکن اس کے باوجود شاید ترجمہ لکھنے والوں کی کوتاہی کی وجہ سے صفحہ ۶۶ پر عِنَبًا وَّقَضْبًا کا اور صفحہ ۲۶۷ پر وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ کا ترجمہ چھوٹ گیا ہے۔ صفحہ ۲۹۶ پر مصنف نے ایک عنوان قائم کیا ہے "مخالف حالات میں ہدایت کرنے والے" اور یہ صفت رسولوں کی بیان کی ہے حالانکہ اس کے تحت انہوں نے جو آیت بیان کی ہے قرآن نے اس سے مصلحین کی جماعت مراد لی ہے ـــــ صفحہ ۱۰۰ پر لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ کا ترجمہ "خدا کی رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے" اور صفحہ ۱۱۹ پر اَتْقَاكُمْ کا ترجمہ "زیادہ ادب والا" بھی محل نظر ہیں۔

(باقی بر صفحہ نمبر ۴۷)

محی الدین پرنٹر پبلشر نے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر "میثاق" رحمانپورہ اچھرہ لاہور ۱۲ سے شائع کیا۔

Regd. No L. 7360

Monthly "MEESAAQ" Lahore.

AUGUST 1963

چند اہم مطبوعات

تصانیف مولانا امین احسن اصلاحی

تدبر قران (قران فہمی کی رہنما)	3—25
تدبر قران (تفسیرآیہ بسم‌اللہ و سورہ فاتحہ)	0—75
اسلامی قانون کی تدوین	3—00 و 2—00
عائلی کمیشن رپورٹ پر تبصرہ	2—25
تزکیہ نفس	6—00 و 3—75

مطبوعات دیگر مصنفین

حضرت محمد ص	22—50
(آنحضرت ص) سیرت ابن ہشام	10—00
ابوبکر رض صدیق اکبر	10—00
عمر رض فاروق اعظم	20—00
امام اعظم رح	4—00
حیات امام احمد بن حنبل رح	10—00
آثار امام شافعی رح	12—00
حیات امام مالک رح	10—00
حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہ رح	21—00
زاد سفر (حصہ اول)	3—75
قادیانیت	4—00
ISLAM & THE WORLD	4—00

مکتبہ میثاق (رحمان پورہ) اچھرہ ۔ لاہور ۔ 12